فروری 1989

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿القرآن الکریم﴾

وہ فلاح پاگیا جس نے تزکیہ کر لیا اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا پھر نماز کا پابند ہو گیا۔

ماہنامہ

المرشد

چکوال

بیاد

شیخ العرب والعجم صدیقِ دوراں مجددِ طریقت، مجتہد فی التصوف بحرِ علوم شریعت قلزمِ فیوض و برکات، امامِ اولیاء، شیخ سلسلۂ نقشبندیہ اویسیہ حضرت العلام اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ

دار العرفان منارہ ضلع چکوال

تصوّف کیا ہے؟

لُغت کے اِعتبار سے تصوّف کی اصل خواہ صوف ہو اور حقیقت کے اِعتبار سے اس کا رشتہ چاہے صفا سے جا ملے، اس میں شک نہیں کہ یہ دین کا ایک اہم شعبہ ہے جس کی اساس خلوص فی العمل اور خلوص فی النیّت پر ہے اور جس کی غایت تعلق مع اللہ اور حصُولِ رضائے اِلٰہی ہے۔ قرآن و حدیث کے مطالعے، نبیِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ اور آثارِ صحابہؓ سے اس حقیقت کا ثبوت مِلتا ہے۔

(دلائِل السُّلُوک)

بنیاد حضرت العلام مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

جلد : ۱۰ شمارہ : ۴

سرپرست
حضرت مولانا محمد اکرم اعوان
مدظلہ العالی

ماہنامہ

المرشد

دار العرفان
منارہ
ضلع چکوال

رجب المرجب ۱۴۰۹ھ — فروری سنہ ۱۹۸۹ء

مدیر مسئول
پروفیسر حافظ عبد الرزاق
ایم اے (اسلامیات)، ایم اے (عربی)

مدیر
تاج رحیم

بدل اشتراک

فی پرچہ	۱۰ روپے
چندہ سالانہ	۱۰۰ روپے
ششماہی	۵۵ روپے
تاحیات	۷۰۰ روپے
سری لنکا، بھارت، بنگلہ دیش	۲۰۰ روپے
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور مشرق وسطیٰ کے ممالک	۵۰ سعودی ریال
تاحیات	۳۰۰ سعودی ریال
برطانیہ اور یورپی ممالک	۱۰ سٹرلنگ پونڈ
تاحیات	۵۰ سٹرلنگ پونڈ
امریکہ اور کینیڈا	۲۰ امریکن ڈالر
تاحیات	۱۰۰ امریکن ڈالر

سول ایجنٹ:
اویسیہ کتب خانہ
الوہاب مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فہرست مضامین

اداریہ		۲
موت سے زندگی تک	حضرت مولانا محمد اکرم	۳
برکات نبوت	"	۱۱
موت ہے آغاز زندگی	"	۱۸
مومن کیوں	"	۲۶
قرب الٰہی	"	۳۱
اصحابِ کہف	"	۳۴
یادیں اُن کی	میجر غلام محمد	۴۰

طابع و ناشر: حافظ عبد الرزاق ○ مطبوعہ: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور ○ مقام اشاعت: دار العرفان منارہ، ضلع چکوال

اداریہ

ٹیلی ویژن پر میوزک ۸۹ء کے نام سے مغربی طرز کا ایک ہنگڑا پروگرام ہوا۔ ہر طرف سے شور اُٹھا۔ مساجد کے لاؤڈ سپیکر گونج اُٹھے۔ گلی گلی، گھر گھر اس کا تذکرہ ہوا۔ ہر محفل میں بحث چھڑی۔ موسیقی کو روح کی غذا کہنے والے اسکی مخالفت میں پیش پیش رہے۔ اسلام پسند سیاستدان اُسے قومی اسمبلی تک لے گئے ـــــ پروگرام بند ہوا۔ سمجھو خطرہ ٹل گیا۔ دین بچ گیا۔ سب مسلمان ہو گئے۔ اسلام کا بول بالا ـــ ہم کتنی آسانی کیساتھ اسلامی معاشرے میں ڈھل جاتے ہیں۔ ذرا دھمکی دی، جلوس نکالے، جہنم کے عذاب سے ڈرایا اور سب ٹھیک ہو گیا۔ کاش! یہ اتنا ہی آسان ہوتا۔ نوجوان نسل کی بغاوت کسی بپھرے ہوئے دریا کی تباہ کن طغیانی ہے۔ یہ کسی ہانڈیا میں اُبال تو وہ نہیں کہ پھونک یا پانی کا چھینٹا مارنے سے بیٹھ جائیگا۔ سیلاب کو روکنا ہو تو سیلاب آنے سے بہت پیشتر اسکے خطرے کی اہمیت محسوس کرنا ہوتا ہے اسے سمجھنا پڑتا ہے۔ ماہرین کی خدمات حاصل کیجاتی ہیں۔ اُن کی تحقیق اور رپورٹوں کی بنیاد پر پلاننگ کیجاتی ہے۔ سینکڑوں انجینیئرز، کاریگر اور ہزاروں مزدور بھاری بھرکم مشینوں سمیت شب و روز محنت کر کے بند باندھتے ہیں۔ نئے راستے بناتے ہیں اور یوں آنیوالے سیلاب کی شدت کو کم کر کے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ اور ہم سیلاب کو دھمکیوں سے روکتے ہیں کہ باز آ جاؤ ورنہ عذاب کی آگ کی تپش سے تمہارا تمام پانی بخارات بنکر اڑ جائیگا۔ ہم ہر سیلاب کو چولہے پر رکھا ہوا چائے کا پانی سمجھتے ہیں ـــــ ہم نے ان بھٹکے ہوئے نوجوانوں کو عذاب جہنم کا پیغام دیکر اور شور مچا کر وقتی طور پر سکرین سے ہٹا دیا اور اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ آجتک ہم نے اِن کی تربیت اور صحیح راہنمائی کیلئے کیا کیا ہے؟ ہمارے پاس نظامِ تعلیم وہی گھسا پٹا ہے جو انگریز جاتے جاتے ردی سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ یونیورسٹی کالجوں سے فارغ التحصیل معاشی اور معاشرتی MISFIT نکلتے ہیں۔ جو دینی مدرسے ہیں اُن سے نکلنے والے معاشی طور پر اسی گرے ہوئے معاشرے کے محتاج (PARASITE) ہوتے ہیں جو علم، عمل، شکل و صورت اور رہن سہن کے لحاظ سے قابلِ تقلید نہیں سمجھے جاتے بلکہ عملی طور پر اُن کو تیسرے درجہ کا شہری سمجھا جاتا ہے ہمارے اِن بنیادی اور دینی اداروں کے تربیت یافتہ نوجوان یا تو ٹیلیویژن پر میوزک ۸۹ء جیسے پروگراموں کی زینت بن سکتے ہیں یا جلوس نکال کر آگ لگا کر، توڑ پھوڑ کر کے، عذاب الٰہی سے ڈرا کر دل کی آگ بجھا سکتے ہیں ـــــ ہم خود ظالم ہیں، قصوروار ہیں۔ اس گناہ کی پوچھ ہم سے ہوگی کہ ہم نے بھٹکنے والوں کو عذابِ جہنم کی خبر دی، سیدھا راستہ نہیں دکھایا اُنکو۔ اُن کی ضروریات کو، نئے حالات کے تقاضوں کو اور اُنکے بھٹکنے کی وجہ کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ البتہ انکو اپنے غلط رسم و رواج، بگڑی تہذیب اور علاقائی فرسودہ روایات پر بزور ڈانگ چلانے کی کوشش کی کہ یوں کرنا ہمارا حق ہے اس لئے کہ ہم اُن سے اس دنیا میں پہلے آئے ہیں۔ اللہ کو ظالم، جابر اور صرف عذاب دینے والا سمجھا اور یہی خوف نئی نسل کے ذہن میں دین کے نام پر ڈالنے میں زندگی صرف کر دی۔ اُنکو اللہ کی محبت سے دور رکھا۔ اللہ کو رحیم کریم اور بے انتہا محبت کرنیوالی ہستی نہ سمجھا نہ سمجھایا۔ اپنے لیے جنت اور دوسروں کیلئے جہنم الاٹ کر دیا۔ نئی نسل نڈر واقعہ ہوئی ہے۔ کھل کر سامنے آ رہی ہے۔ تاریک کوٹھری کے دروازے بند کر دینے سے کوٹھری روشن تو نہیں ہو جائیگی ہم نے کبھی نوجوان نسل کے دلوں میں جھانک کر دیکھا ہے؟ وہاں محبت الٰہی کیلئے گداز گوشوں کو محسوس کیا ہے؟ ہم نے تو اپنے دل ٹٹولنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ ہمارے اپنے دلوں کی کوٹھڑیاں تاریک ہیں چراغ بجھے ہوئے ہیں۔ وائرنگ فرسودہ ہو چکی ہے۔ بجلی کے کنکشن کٹے ہوئے ہیں۔ نئے مکانوں کی وائرنگ تو ابھی نئی ہے۔ بلب بھی نئے ہیں۔ پہلے ہم اپنے کنکشن تو جوڑ لیں، اپنے دل کے چراغ روشن کر لیں تب ہی نئے مکان اور اس کے مکینوں کو روشنی دے سکیں گے۔

تاج رحیم

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان

موت سے زندگی تک

مکہ مکرمہ ۲۰ر جنوری سنہ ۱۹۸۹ء بروز جمعۃ المبارک

زندگی اور موت کس قدر قریب قریب بستی ہیں شاید یہ بات اس آدمی کو سمجھ نہ آئے جو زندگی بھر موت سے بھاگتا ہی پھرا ہو اور اپنے اب تک زندہ رہنے کو اپنی اس کوشش ہی کا ثمر شمار کیے بیٹھا ہو مگر کچھ لوگوں کو ایسے حالات سے گزرنا پڑتا ہے کہ وہ زندگی اور موت کو بہت ہی قریب قریب بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ دیکھتے ہیں۔ مثلاً جنگ عظیم میں جن لوگوں نے عملاً حصہ لیا تھا ان کی اکثریت تاحال بقید حیات ہے کبھی کسی سے ملاقات ہو تو ذرا ان دنوں کی کوئی داستان سنئے گا کس طرح ہر قدم موت کے سینے پر پڑتا تھا۔ پھر کچھ لوگوں کو وہ نکل بھی کچھ بچ جاتے گولیوں کا مینہ برستا ساتھی ستاروں کی مانند ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے اور بچنے والے ان کی مدد تو کیا کرتے ہاں ان کے بے جان جسموں کو بھی بعض اوقات ڈھال بنا کر پیچھے لیٹ جاتے۔

ہمارے وہ سکول کے دن تھے اور علاقہ فوجی چنانچہ متعدد گھروں میں موت کی اطلاعات کا آنا روزانہ کی بات تھی۔ اور آہ و بکا کی آواز کسی نہ کسی سمت سے ضرور سنائی دیتی تھی۔

پھر ملک تقسیم ہوا اور مملکت خداداد پاکستان کو اللہ نے وجود بخشا مگر یہ طلوع سحر بھی صد ہزار انجم کے خون سے تر تھی جس طرح مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی اور خون کی ندیاں بہہ نکلیں ان تمام خونیں مناظر کے نہ صرف چشم دید گواہ موجود ہیں بلکہ ان مظلوم خاندانوں کی یادگاریں یعنی جو ایک آدھ فرد گھر کی لاشوں میں دبا ہوا نیم مردہ رہ گیا اور پھر زندگی سے ہمکنار ہوا ابھی تک باقی ہیں اس موضوع پر بھی بے شمار لوگوں نے لکھا اور تاحال ناول مضامین اور افسانے کے روپ میں لکھتے رہتے ہیں کبھی نسیم حجازی صاحب کی تصنیف "خاک و خون" نظر سے گذری ہو تو آپ نے اندازہ فرمایا ہوگا۔

پھر ملک سے ایک اور ملک بنا بنگلہ دیش آپ نے دیکھا ہوگا تو وہاں کا حال سنا ضرور ہوگا ایسے ہی افغانستان کا گذشتہ عشرہ، فلسطین و لبنان کا حال، ایران کا انقلاب۔ یہ سب تو جنگ کی باتیں ہیں۔ پُر امن شہروں اور پُر سکون آبادیوں میں بھی زندگی اور موت کا کھیل مسلسل عمل پذیر ہے۔ کسی تن مردہ کو زندگی نصیب ہوتی ہے تو کوئی زندگی سے بھرپور پیمانہ چھلک کر گر جاتا ہے یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی (القرآن) قدرت کی یہ کرشمہ سازی ہر آن اور ہر جگہ جاری ہے ہاں جب بظاہر حالات بھی زیر و زبر ہو جائیں تو ذرا پردہ زیادہ سرک جاتا ہے اور عام آدمی بھی محسوس کرنے لگتا ہے کہ واقعی موت بھی زندگی کے ساتھ ہے ورنہ صرف اللہ کے خاص بندوں کی نگاہ اس پر رہتی ہے جیسے ایک بزرگ کے بھائی کی وفات پر کوئی دوست افسوس کے لیے گیا تو باتوں باتوں میں پوچھ لیا ان کی موت کا سبب کیا تھا غالباً مرض جاننا چاہتا ہوگا مگر انہوں نے فرمایا اس کی زندگی۔ اللہ اور موت کا بیان

سبب ارشاد فرمایا کہ انسانی زندگی ہی انسانی موت کا سبب اس عالم میں تو ہے اس سب کے باوجود یہ یقین رکھنا کہ موت ہے اور مجھے بھی آئے گی ہم سب کی مجبوری ہے۔ یقیناً اکثریت اس حقیقت کو فراموش کیے رکھتی ہے دنیا اور اس کی لذتیں انسان کو اس قدر الجھا لیتی ہیں کہ صرف موت کی تلخی ہی اسے ہوش میں لاتی ہے مگر تب تک پل کے نیچے سے پانی گزر چکا ہوتا ہے ہاں کچھ خوش نصیب ایسے ضرور ہوتے ہیں جو دنیا میں رہتے ہوئے بھی موت سے غافل نہیں ہوتے۔ موت کو نہ صرف یاد رکھتے ہیں بلکہ اس کی تیاری میں لگے رہتے ہیں یہ ان لوگوں پہ اللہ کریم کا خاص کرم ہوتا ہے۔ اس سے آگے بھی ایک بات اور ہے۔ وہ ہے کسی حد تک عملی تجربہ جہاں موت کا عملی تجربہ یہ کشفاً مشاہدہ سے سے آگے ہے اور چند قطرے میں نے بھی چکھے ہیں جبھی تو یہ کہانی لے بیٹھا کہ کہاں وہ موت کی گہری وادیاں اور کہاں پھر سے حیات نو کے ساتھ بیت اللہ شریف کے طواف جو کبھی نگاہیں کرتی ہیں اور کبھی میرے لڑکھڑاتے قدم۔ ان سب کا ایک تاثر تو یہ ہے کہ میں قلم لے کر لکھنے بیٹھ گیا میرا دل چاہا کہ ان لوگوں کو ضرور شریک سفر رکھوں جن کی دعاؤں نے مجھے پھر دیار حرم اور در حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری کی سعادت بخشی۔ تو سنیئے ہم نے موت کو کہاں اور کیسے دیکھا اور ہمیں کیسی لگی۔ آئیے بات شروع سے کریں۔

گذشتہ برس گرمیوں میں صحت بہت خراب رہی اور بہت سے پروگرام ملتوی ہو گئے جب سفر کے قابل ہوا تو کوشش یہ تھی کہ تمام پروگراموں کو تاخیر سے سہی مگر عملی جامہ ضرور پہنایا جائے۔ لہٰذا مسلسل سفر ہی درپیش رہا اس کے باوجود گلگت اور کوئٹہ دو جگہوں پر حاضری نہ ہو سکی۔ ان شاء اللہ امسال ضرور حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔ بہرحال ۲۹، دسمبر کو فارغ ہوا اور شام کو گھر پہنچا۔ ۳۱ دسمبر کی رات پنڈی جا کر ٹھہرا۔ ڈاکٹر عظمت کو بھی آنا تھا وہ دیر سے پہنچے بہرحال یہ سرد رات ۲۰۰۰ء کی آخری شب تھی اور صبح ۲۰۰۱ء کا تازہ دم سورج دیکھنے کی امید میں سو گئے صبح یکم جنوری جیپ کے ذریعے پشاور جانا تھا تاہم جیپ کا اہتمام کرتے اور دوستوں سے رابطہ کرتے کافی دیر ہو گئی گھر سے ڈاک اٹھا لایا تھا۔ احباب کو جوابات لکھے اور یوں دیر سے سویا خیالوں میں وہاں سے بہت دور کسی اگلی منزل پر جو خوبصورت بھی تھی اور پرخطر بھی مگر حسن تو ہمیشہ خطرات میں ہی نظر آتا ہے۔ ہر پھول کانٹوں میں گھرا ہوتا ہے اور جن پھولوں پہ کانٹوں کا پہرہ نہ ہو عموماً خوشبو سے خالی اور نظر کا دھوکہ ہی ثابت ہوتے ہیں کچھ بات مزاج کی بھی ہے کہ میرا مزاج بھی خطر آشنا سا ہے۔

بہرحال رات ڈاکٹر صاحب آ گئے اور علی الصبح تہجد اور ذکر کے بعد لینے والے احباب بھی نماز سے فارغ ہو کر چائے کا کپ پیا اور اللہ پر بھروسہ کر کے نکل کھڑے ہوئے پشاور روڈ سے دوسری گاڑی لینا تھی۔ وہاں ایک بار پھر چائے کا کپ پینا پڑا اور بہت خوبصورت مضبوط نئی اور قیمتی جیپ اپنے تجربہ کار ڈرائیور کے ساتھ ہماری راہ دیکھ رہی تھی اس نے ہمیں اپنے دامن میں سمیٹا اور یوں سپیدۂ سحر پھیل رہا تھا جب ہم عازم پشاور ہوئے . . . ۱ جنوری۔ جہاں کل چھوڑی تھی بات وہاں سے شروع کرتے ہیں تو ڈرائیور نے بڑی سڑک پر گھومتے ہی رفتار بڑھا دی اور جیپ بہت تیز دوڑنے لگی میں پیچھے گھوم کر عظمت سے بات کرنے لگا کہ ہمارے سامنے جاتی ہوئی ارجن ٹرانسپورٹ کی بہت بڑی بس ایک دم دائیں مڑ گئی۔ حالانکہ یہ جگہ اس کے مڑنے کے لیے نہ تھی پھر اس نے کوئی اشارہ بھی نہ دیا غالباً وہ ان تکلفات سے پاک تھی اور اشارے وغیرہ اس میں تھے ہی نہیں حادثات تو دنیا بھر میں ہوتے ہیں مگر وطن عزیز کے حادثات عموماً لاپرواہی کے باعث ہوا کرتے ہیں اور ہم بھی ایک بس ڈرائیور صاحب کی لاپرواہی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔

داد دیجیئے ہمارے مشاق ڈرائیور کو بھی جس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اور بریک وغیرہ لگانے کے تکلف سے بے نیاز پوری رفتار پر جیپ اس کے ساتھ دے ماری آخر تو یہ صاحب بھی ڈرائیور تھے انہیں تکلفات میں پڑنے کی کیا ضرورت۔ میں سامنے متوجہ ہونے لگا تو بس اور جیپ میں چند گز کا فاصلہ تھا جس نے مجھے پھرنے کا موقع بھی نہ دیا کہتے ہیں بڑے زور کا دھماکہ ہوا تھا۔ روایت سنی ہے دھماکہ یاد نہیں ہاں درد اُٹھا تو نیم باز آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی جن میں سے بائیں آنکھ پر تو خون کا پردہ سا تھا۔ دائیں آنکھ سے معمولی سمجھ آئی کہ میں سیٹ اور گاڑی کے ڈیش بورڈ کے درمیان بُری طرح پھنس چکا تھا عظمت کی آواز آئی تو بتایا کہ میں سانس نہیں لے سکتا اگر سیٹ کو پیچھے کھینچ سکو تو شاید اور اس نے کوشش کی مگر یہ اتنا آسان نہ تھا جیسا کہ بعد میں پتہ چلا ہوا یہ کہ پچھلا آدمی میری سیٹ کی پشت سے اس زور سے ٹکرایا کہ یہ آگے ٹیڑھی ہو گئی اور اس آدمی کی ریڑھ کی ہڈی کا مہرہ کریک ہو گیا۔ سامنے سے اس زور کا دھکا لگا کہ بس کی باڈی بھی پھٹی اور جیپ کے سامنے ونچ لگا ہوا تھا۔ سامنے کا بمپر ٹوٹا۔ ونچ ٹوٹ کر پیچھے ہٹا ریڈی ایٹر کو پھاڑ کر انجن کو متاثر کیا جیپ تک ٹیڑھی ہو گئی۔ میرا سر سامنے بڑے

شیشے سے اس زور سے ٹکرایا کہ شیشہ اور سر دونوں پھٹ گئے۔ ماتھا شق ہوا ابرو پھٹا اور پلکوں کے نیچے پپوٹا پھٹ گیا، مگر اللہ کی شان آنکھ محفوظ رہی۔ سینے کو ایک طرف سے ڈیش بورڈ اور دوسری طرف سے سیٹ نے اس طرح دبایا کہ دائیں طرف کی چار پسلیاں کریک ہوئیں مگر ٹوٹی نہیں۔ سینے کے درمیان والی نرم ہڈی میں بال آگیا۔ بیٹھ کی ہڈی متاثر ہوئی عظمت نے جلدی سے دروازہ کھولا اور میں باہر جھول گیا۔ حسن اتفاق ایک نیول بری ڈاکٹر اپنی گاڑی میں گذر رہے تھے وہ رک گئے کچھ ساتھ والے لوگ پہنچ گئے تھے سب نے عظمت کا ساتھ دیا یوں انہوں نے مل کر مجھے باہر کھینچ لیا ان کی کار کی پچھلی سیٹ پر ڈالا اور ہسپتال کو بھاگے یہ تو ظاہر کی کہانی تھی۔ میں خود کہاں تھا تو سنیئے ایک بہت خوبصورت اور حسین وادی میں، جہاں واقعی صبح پھیلی ہوئی تھی مگر ابھی سورج سامنے نہ تھا حد نگاہ تک سبزہ بچھا ہوا تھا جس میں ننھے منے پھولوں سے گل کاری کی ہوئی لگتی تھی بہت ہی پیاری ہوا اور نہایت سکون سے چل رہی تھی، خوبصورت پانی بہہ رہا تھا جو نہ دریا لگتا تھا کہ اتنا پھیلاؤ نہیں تھا کہ اس سے بڑا تھا۔ اور تھوڑا تھوڑا کناروں سے باہر دور تک پھیل کر بہہ رہا تھا۔ اتنا شفاف کہ تہہ میں بچھے ہوئے پتھر نظر آرہے تھے جو رنگ برنگے تھے اور مختلف روشنیاں بکھیر رہے تھے حد نظر تک ٹیلوں کی اپنی بہار تھی۔ آسمان کی سمت انوکھی روشنیوں کی بہار تھی۔ درخت اور جھاڑیاں اپنے طور پر مست غرض ہر شے جھوم رہی تھی وقت کا احساس نہ تھا اور دنیا سے تعلق دو دو کا تھا کہ ہر حرکت پر اٹھنے والی ٹیسیں مجھے واپس بلانے کی کوشش کرتی تھیں آنکھ کھولتا تو اردگرد کے دھندلے سے نقوش ضرور نظر آتے اور لوگوں کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتی تو کم از کم لفظوں میں جواب دینے کی کوشش کرتا۔

فوجی ہسپتال میں پہنچے انہوں نے فوراً ایکسرے وغیرہ لیے ٹیکے لگائے ماتھے پر ٹانکے لگائے پیٹی کی بانہہ پہ پٹی باندھی اور گاڑی میں ڈال دیا کاش میں کبھی ان ڈاکٹر صاحبان سے ملوں جو مجھے یہاں لائے تھے یہاں سے فارغ ہو کر جا چکے تھے اور یہ ایک لمبا عمل تھا جس کے دوران مجھے مختلف کمروں، میزوں اور مشینوں کے سامنے سے گذرنا پڑا مگر میں کہاں تھا۔ اس خوبصورت وادی میں جو مجھے نظر آرہی تھی محسوس ہو رہی تھی جہاں کوئی بھی نہ تھا حتیٰ کہ میں خود بھی نہ تھا، شاید اس لیے کہ روح تو ابھی جسم میں ہی مقید تھی اور اسی ٹوٹے ہوئے پنجرے میں سے اس چمن کی بہار دیکھ رہی تھی مگر وہاں اکیلے پن کا احساس بھی نہ تھا شاید یہ برزخ کا کوئی گوشہ تھا اور واقعی ایسی جگہ تھی جہاں صدیاں بیت جائیں مگر خبر نہ ہو اور میں ابھی داخل ہوا تھا جب ہسپتال کی گاڑی میں لاد لیا گیا۔ تو مکمل واپس آچکا تھا شاید آگے کس قدر حسن بکھرا ہو یہ تو مالک ہی جانے ویسے موت کا حسن بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے بشرطیکہ اللہ کرے اس کے حسین رخ سے تعلق ہو ورنہ تو دوسرا رخ بھی رکھتی ہے جو بہت بھیانک ہے جس کے بارے پڑھا بھی ہے بحمداللہ کتنا دیکھا بھی اور کشفاً دیکھنے تو اس رخ کو ربع صدی سے زیادہ عرصہ بیت گیا مگر یہ عملی مشاہدہ اپنی الگ حیثیت رکھتا ہے۔ بات لمحوں کی تھی مگر اس نظارے کے لیے عملاً موت کے جبڑوں میں جا کر ہی بات بنی اب ہوش میں آیا تو جسم کچلا ہوا تھا سر پھٹا ہوا سینہ چاک بائیں کولہے پر باہر سے چوٹ پڑی تو اندر تک پٹھے رگیں ٹانگوں کے سارے مسل ہر چیز بری طرح کچلی گئی تھی اور ہر شے اپنی الگ سُر نکال رہا تھا، سارا جسم بج رہا تھا۔ آفیسرز وارڈ میں جگہ ملی ایک ایک کمرے میں تین تین مریض تھے جس کمرے میں میں تھا وہاں ایک بزرگ تھے ان کا گردہ نکال دیا گیا تھا اور ایک جوان افسر جس کی دونوں ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں کسی حادثے نے ایک خوبصورت نوجوان سے دونوں پاؤں چھین لیے تھے باقاعدہ پٹی کروا کر اجازت لی اور رات پنڈی گھر پہ آگئے۔ ہسپتال کے ماحول میں اس قدر درد تھا، ایسی سوگواری چھائی ہوئی تھی کہ قوت برداشت جواب دے گئی حال یہ تھا کہ دو آدمی پاؤں سنبھالتے ایک کمر اور ایک سینے اور گردن کے نیچے ہاتھ دیتا تب میں اٹھ کر دوائی کھاتا سرجن صاحب کا خیال تھا کہ کم از کم چھ مہینے واپسی میں لگیں گے، ادھر مجھے تو بارہ جنوری کو عمرہ کے لیے جانا تھا۔ لوگ مڈل ایسٹ سے برطانیہ سے اور امریکہ تک سے اس میں شمولیت کے لیے تیار تھے اسی شام کرنل مطلوب لاہور سے تشریف لائے حالت دیکھی پروگرام کے بارے پوچھا کیا بتاتا میں لہٰذا مشائخ عظام کی طرف متوجہ ہوا فرمایا ہفتہ تاخیر سے چلے جاؤ انشاء اللہ جا سکو گے، ہم نے ایک ہفتہ موخر کر دیا۔

احباب کی آمد شروع ہو گئی جو سنتا چل پڑتا بہرحال تیسرے روز شام میں لاٹھی کے سہارے کھڑا ہونے لگا تو گاڑی میں بیٹھ کر گھر چلا گیا اور ۱۹ کو گھر سے پنڈی اور شام چل کر رات جدہ پہنچ گیا اہلیہ اور دو چھوٹے بچے ہمراہ تھے، عمرہ پہ آنے والے لگ بھگ اٹھارہ ساتھی بھی ساتھ تھے اللہ کا شکر ہے کہ پھر سے حرم شریف کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی اور کل ۲۰ جنوری کو پہلا عمرہ کیا طواف کیا

اور سعی کے تین چکر بھی لاٹھی کے سہارے لگائے باقی چار چکر کے لیے کرسی پر بیٹھنا پڑا۔ مگر آج اللہ کریم سے امید ہے طواف اور سعی کر لوں گا انشاءاللہ

۱۸ جنوری کو پچھلے پہر بہت تکلیف ہوئی اس لیے کہ دوا ختم ہو گئی تھی اور ۱۹ جنوری کو پنڈی جانا تھا سو چا وہاں جا کر لے لوں گا مگر یہ قاعدہ نقصان دہ ثابت ہوا اور بہت درد سہنا پڑا۔ غرض صبح ہوئی علی الصبح روانہ ہوئے پنڈی عظمت بھی آ گئے۔ اور ڈاکٹر سے فون پر رابطہ کر کے دوا لی کچھ احباب ملاقات کے لیے جمع تھے، ہسپتال جانا پڑا احتیاطی ٹیکوں کے لیے اور یوں چھ بجے شام ہم سخت سرد ہوا کو چیرتے ہوئے جہاز تک پہنچے اندر درجہ حرارت نارمل تھا عمرہ پہ رفاقت کے طالب سبھی لوگ ہمراہ تھے۔ جہاز روانہ ہوا اور یوں ہم خیال در حبیب پر بوسہ زن تھے کہ ہوائی میزبانوں کی آواز نے چونکایا اعلان کا آخری حصہ سنا کہ ہم پانچ گھنٹے پرواز کر کے ریاض جا اتریں گے پھر کھانا سرو ہونے سے پہلے بچوں نے پانی مانگا ایک دوست کو بچے کے ساتھ بھیجا تو جواب آیا کہ کولڈ ڈرنک تقسیم کیا جائے گا ویسے ہم نہیں دیتے حالانکہ بین الاقوامی پروازوں میں تو تقریباً کوئی پابندی نہیں ہوتی جب کوئی چاہے مانگ لے ہاں یاد آیا امریکہ کی ہوائی کمپنی T.W.A والے بھی ایسے ہی فیاض ہیں پھر تقسیم ہونا شروع ہوا تو ہوائی میزبان ایک ڈبے کو دو دو گلاسوں میں بانٹ کر حاتم کی قبر پہ لات مار رہی تھی بڑی حیرت ہوئی کہ ہزاروں روپے ادا کر کے ٹکٹ حاصل کرنے والا مسافر غریب کولڈ ڈرنک کو بھی ترسے ہی گا۔

پھر کھانا تقسیم ہوا مرغ تھا اور سلاد دہی اور پہلی بار جہاز میں جلیبیاں دیکھیں۔ چند چمچ چاول کھائے دہی اور سلاد اور بدقسمتی سے گوشت کے چھوٹے چھوٹے تین چار ٹکڑے بھی کھا لیے جنہوں نے رات بھر تنگ کیا طبیعت خراب اہلیہ نے کہا پیٹ میں درد ہے بچے کا دل گھبرا گیا۔ بچی نے باقاعدہ قے کر دی کچھ سمجھ نہ آئی کہ ماجرا کیا ہے۔

رات تو خیر ہوش کسے تھی۔ دوسرے دن صبح خیال آیا کہ یہ مرغ تو مشینی ذبح ہوتے ہیں، جو درآمد کیے جاتے ہیں اور سعودیہ میں تو فتویٰ ان کے حلال ہونے کا ہے تو لاہور کی ایک دعوت بھی یاد آئی۔ ایک بار وہاں بھی مرغ کھایا تھا جو بعد میں بہت مہنگا ثابت ہوا تھا رات گیارہ بجے پاکستانی وقت کے مطابق ریاض پہنچے وہاں نیچے اترنا اور امیگریشن وغیرہ کرانا تھا جو واقعی بڑا تھکا دینے والا کام ہوتا ہے اور دنیا کے جس ملک میں آپ جائیں یہ سب کچھ ضرور بھگتنا پڑتا ہے پھر یہاں تو ایک خاص ادا سے بے نیازی بھی ہوتی ہے بادشاہت ہے اور ہر سپاہی بادشاہت کا نمائندہ ہوتا ہے مگر تماشہ یہ ہوا کہ کچھ ہی لوگ فارغ ہوئے تھے کہ ڈیوٹی تبدیل ہونے کے اوقات آ گئے حضور سب نے قلم مہر وغیرہ رکھا ہاتھ جھاڑے اور چلے گئے ظاہر ہے نئے لوگوں کے سیٹ پر بیٹھنے میں کچھ وقت تو لگتا تھا وہاں سے فارغ ہوئے تو جہاز کا عملہ بڑی پھرتی دکھا رہا تھا چلیں بھئی جلدی چلیں۔ غرض کیا بندہ خدا ابھی تو وضو کریں گے۔ عشاء پڑھیں گے اور احباب احرام باندھیں گے اس لیے کہ ابھی بہت لوگ باقی ہیں یہ بھی عجیب بات ہے جہاز مکہ مکرمہ سے ایک طرف سے ہو کر گزرتا ہے مگر حد حرم کے ایک کونے کو عبور کرتا ہے اور جہاز والے ضرور بتاتے ہیں کہ احرام باندھنے والے لوگ باندھ کر گزریں مگر علماء کا مسلک یہ ہے کہ فضا میں نماز ادا نہیں ہوتی اس لیے کہ جہاز کا تعلق بیت اللہ شریف سے نہیں ہوتا۔ ہاں بحری جہاز یا ریل وغیرہ کی بات دوسری ہے تو پھر حد حرم سے جہاز کا فضا میں کیا تعلق ہے سعودی قوانین کا مسلک یہ ہے کہ فضا میں بھی نماز ہو سکتی ہے لہذا اس مسلک کے حضرات کو ضرور احرام باندھ لینا چاہیئے چنانچہ نماز ادا کی کچھ احباب نے احرام باندھا کچھ نے جدہ پہنچ کر باندھنے پہ چھوڑا اور یوں بس میں بیٹھے پتہ چلا جہاز تبدیل ہو چکا ہے لہذا ہم رات کو ایک بجے سعودی وقت کے مطابق جدہ پہنچے جہاں کسٹم کا مسئلہ درپیش تھا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ پاکستانیوں کی عزت نہیں کرتے یا ان سے نامناسب سلوک کیا جاتا ہے مگر جب بھی حاضری نصیب ہوئی دیکھا یہی ہے کہ پاکستانی انہیں تنگ کرتے ہیں اور یہ اللہ کریم کا احسان ہے کہ تین چار بار سال میں یہ سعادت نصیب ہو جاتی ہے۔ ذرا اب کی بار جو دیکھا وہ بھی سن لیں کہ متعدد لائنیں بنا دی گئیں اور کئی کاؤنٹر کام کرنے لگے پہلے تو دور رہا جب قریب پہنچا تو دیکھا تو دیکھا کہ ایک صاحب خواہ مخواہ ایئر سٹاف کی وردی پہنے ہوئے تھے۔ مقصد صرف رعایت حاصل کرنا تھا انہوں نے اپنی بات کی ساتھ ایک اور شریف آدمی کی بھی سفارش کر دی۔ کسٹم افسر نے بڑی عزت کی ہنس ہنس کر بولا مگر ایک ایک چیز کو دیکھا اور بہت وقت لگایا پھر ایک مولانا صاحب کی باری آئی انہوں نے عربی میں باتیں کیں اس نے کہا سامان لائیے سمجھے شاید جان چھوٹی تین چار ساتھیوں کا بھی کہہ دیا۔ اس نے سب کا سامان منگوا لیا اور ایک ایک کپڑا الگ کر دیا کافی دیر سمیٹتے رہے پھر دو سرحدی جوان تھے ان کے بورے جو کھلے تو جوتے کئی جوڑے خشک

فروٹ کی متعدد گتھیاں، مٹھائیاں، بھنے ہوئے مکی کے دانے بیچے اخروٹ اور نہ جانے کیا کچھ کسٹم والے نے بھی چاقو منگوا کر سب کو پھاڑا، جوتوں کو دوہرا کر کے دیکھا پھر ایک جوتے کے تلے ادھیڑنے کا کہا غرض رہی کسر انہوں نے پوری کردی، میری طرف دیکھا پوچھا کیا ہے کہا یہ بیگ ہے مگر یہ ریاض چیک ہوا ہے اور یہ کبس کہنے لگا بس بس کہا بیگ اُٹھالیں بکس کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا ہنس کر کہا کچھ ہے میں نے کہا سامنے ہے جو کچھ ہے کہنے لگا لے جائیں تو سمجھ آئی کہ تھوڑا ان لوگوں کا کم اپنا زیادہ ہوتا ہے بہرحال ایک سے تین یہاں بیچ گئے ابھی لوگ باقی تھے باہر نکلے ساتھی منتظر تھے۔ زاہد کے ساتھ گھر چلے گئے احباب سیدھے مکہ مکرمہ قیام گاہ پر چلے گئے اور ہم کل صبح جدہ سے چل کر پہنچے سب نے مل کر عمرہ ادا کیا۔ اگرچہ درد تھا مگر طواف اور سعی بھی اللہ نے ہمت دی اور آدھی سعی کرسی پر کی یوں کل کا دن تمام ہوا آج علی الصبح درس ہوا۔ سورۃ التغابن کی دوسری تیسری اور چوتھی آیات مبارکہ کا ترجمہ اور کچھ حسب توفیق تشریح عرض کی۔ ما حاصل یہ تھا کہ اسلام اور مذاہب باطلہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام اللہ کی معرفت عطا فرما کر تمام امور اس وحدہٗ لا شریک کے سپرد کرنے کی تلقین کرتا ہے اور ہر کام کو آخرت کے لیے کرنے کا حکم دیتا ہے جبکہ تمام دیگر مذاہب امور دنیا کو عبادات کا حاصل قرار دیتے ہیں یہ سوال کہ اگر سب کچھ اللہ کی طرف سے ملتا ہے تو کام کرنے کی ضرورت کیا ہے تو اسلام کام کرنے کا حکم حصول رزق کی بنیاد کے طور پر نہیں بلکہ عالم اسباب میں اسباب و ذرائع کو اختیار کرنے کو عبادت قرار دیتا ہے اور طلب رزق حلال کو فرض مگر نتیجہ اللہ کی طرف سے ہے اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ مومن کی دنیا بھی دین ہے اور یہی توکل کا مفہوم بھی ہے مگر اصل طلب قرب الٰہی اور رضائے باری کی پیدا فرماتا ہے حتیٰ کہ مومن کی نشانی یہ بتاتا ہے کہ جب اللہ کریم کا ذکر ہو تو اس کا دل روشن ہو جاتا ہے، باغ باغ ہو جاتا ہے اور جب اللہ کریم کی آیات سنتا ہے تو اس کے ایمان یعنی یقین کی کیفیت اور زیادتی ہوتی ہے اور اسے اپنے رب پر جو اس کے ہر حال سے واقف ہر ضرورت پوری کرنے پر قادر اور سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا اور مہربان ہے بھروسہ نصیب ہوتا ہے نہ یہ کہ وہ کام کاج چھوڑ کر گوشہ گیری اپنا لیتا ہے۔ بلکہ کام کو عبادت سمجھ کر مزید حسن و خوبی سے کرتا ہے اور اصل نگاہ اللہ کی رضامندی پر رکھتا ہے اگر زندگی میں کوئی دکھ تکلیف یا تنگی ترشی بھی آئے تو یہ جانتا ہے کہ میرا رب میرے حال سے آگاہ ہے اور جو کچھ مجھ پر وارد ہوا ہے یہی میرے حق میں بہتر صورت تھی ورنہ یقیناً دوسری صورت میں زیادہ نقصان اُٹھانا پڑتا۔ ممکن ہے کوئی دنیا کا فائدہ کسی دینی نقصان کا سبب اور عارضی خوشی دائمی ماحت میں خلل کا باعث بنتی۔ کیونکہ انسان خواہش کر سکتا ہے اسے مانگنے کا حکم ہے اور مالک اتنا کریم ہے کہ زیادہ مانگنے والے پہ زیادہ خوش ہوتا ہے لیکن دُعا بہرحال دعا ہے اسے حکم کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا اللہ کریم کا علم بھی وسیع ہے اور اس کی قدرت بھی کامل وہ خوب جانتا ہے کہ کس کو کونسی شے مناسب ہے اگر بظاہر تکلیف بھی آئے تو مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسے ڈاکٹر اپریشن کرتا ہے کہ بلا ضرورت چیر پھاڑ نہیں کرتا اور فاسد مادوں کو خارج کر کے زخم کا علاج بھی کرتا ہے پھر اس کی قدرت ایسی کامل کہ انسان سمجھ ہی نہیں پاتا بھلا دیکھیں اور شب ہجرت پہ غور کریں۔ ساری مخلوق میں اپنا پیارا بندہ اور بے مثل تخلیق غار کے اندر تشریف فرما ہے۔ بدترین دشمن دہانے پر پہنچ چکے ہیں اسے حفاظت منظور رہے تو کیسا عجیب سبب پیدا فرما دیا اگر انسان سوچے تو کوئی آسمانی بجلی گرنی چاہیئے۔ کسی بہت بڑے اژدہے یا شیر ببر کو حکم ہو کہ مکہ والوں کو بھگا دو، مگر اس کی شان ملاحظہ ہو مکڑی سے فرمایا جالا تن دو سبحان اللہ و بحمدہٖ سبحان اللہ العظیم کیسی شان کبریائی کا اظہار فرمایا کہ دو عالم میں برگزیدہ ہستی کو بدترین دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لیئے روئے زمین کا کمزور ترین سبب استعمال فرمایا اور مشرکین تمہ ناکام و نامراد خاک چھانتے پھرے بھلا انسانی عقل ان امور کو کیسے پا سکتی ہے ہاں اس کی ذات سے ربط نصیب ہو اس کے ذکر سے فرحت حاصل ہو تو پھر اس پر بھروسہ نصیب ہوتا ہے اور انسان ہمہ تن اس کی عبادت میں مصروف ہو جاتا ہے کہ امور دنیا بھی اطاعت الٰہی کا روپ اختیار کر کے درجہ عبادت کو پا لیتے ہیں۔ درس تو طویل مگر کسی حد تک خلاصہ عرض کر دیا ہے۔ پھر دن بھر آرام کیا۔ رات امریکہ سے جو ساتھی آئے تھے عام والے آج رخصت ہوئے بس یہ آنا جانا رہے گا۔ عصر کے بعد عمرہ کیا بالکل حج کا سماں تھا وہی بھیڑ بھاڑ وہی رونق اور انسانوں کا سمندر ہر طرح اور ہر ملک ہر رنگ اور ہر زبان کے لوگ مگر ایک اللہ کے طالب ایک نبی کی اُمت اور ایک دین کے پیروکار یہ لاکھوں ایک ہی بلیہ اللہ مسلمانوں کی عملی سیاسی اور معاشی زندگی میں بھی اتفاق اور ایسا اتفاق جو نیکی پہ ہو نصیب فرمائے آمین۔ آج اگرچہ درد ہوا مشکل بنا مگر اللہ کریم کی عطا سے عمرہ پیدل چل کر ہی پورا کر لیا ہے۔ طواف اور سعی بھی سب

بحمد اللہ

رات لندن سے آنے والے احباب میں سے ایک ڈاکٹر صاحب نے کچھ دوائیاں کھانے کو دیں ایک ٹیکہ بھی کیا۔ مرہم بھی لائے تھے۔ بہر حال امید ہے اللہ کریم ان چیزوں کو مزید صحت یابی کا سبب بنا دیں گے۔ آج فجر کی نماز درست طریقے سے ادا کی پہلے تو کرسی پر بیٹھ کر اشارے سے پڑھتا تھا۔ پھر جب افاقہ ہوا تو کل کا دن فرش پر بیٹھ کر بائیں ٹانگ آگے لمبی کر کے اشارے سے پڑھی اور آج بفضل اللہ درست طریقے سے ادا کر لی۔

رات کرنل صاحب جدہ چلے گئے تھے صبح کینیا کے سفارتخانے جائیں گے اگر ویزے لگ گئے تو ٹھیک ورنہ پھر شاید سب کو جانا ہو گا آج ابھی دن شروع ہو رہا ہے صبح کے ذکر کے بعد نماز فجر اور ابھی ابھی درس سے فارغ ہوا ہوں۔ آج کا موضوع رحمت الٰہی تھا جس میں ربوبیت پر کچھ بات ہوئی کہ کس انداز سے ایک ایک ذرہ مائع گیس اور اور مختلف روپ دھارتا ہوا کبھی پھل، پھول اور کبھی غذا بن کر اس جسم انسانی تک پہنچتا ہے جہاں اس کی ضرورت ہے یا جس جگہ پہنچانے کے لیے اسے پیدا فرمایا گیا یہ اس قدر مربوط اور درست نظام ہے کہ نہ کوئی تنکا فالتو پیدا ہوتا ہے نہ کسی کی کمی کا اندیشہ اور جہان کی ہر ٹوٹ پھوٹ کسی نئی تعمیر کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے یہ ہماری کوتاہ بینی ہے کہ اپنے جیسے انسان کو تو توڑ پھوڑ کرتے دیکھیں۔ بشرطیکہ وہ کاریگر ہو تو جان لیتے ہیں کہ لکڑی کو ٹکڑوں میں کاٹنے والا فرنیچر بنا لے گا یا کپڑے کو بے دردی سے کاٹنے والا درزی اسے لباس کا روپ دے گا مگر جب اللہ کی طرف سے خزاں آتی ہے تو اسے بہار کے آنے کی دلیل کیوں نہیں سمجھ پاتے دراصل اس میں ایک وجہ خود ہماری دست درازیاں بھی ہیں۔ اور جو ٹوٹ پھوٹ ہمارے گناہوں کے نتیجے میں واقع ہوتی ہے وہ نری توڑ پھوڑ ہی ہے۔ قرآن حکیم نے اسے فساد کے الفاظ سے ارشاد فرمایا ہے کہیں فساد سے روکا ہے تو دوسری جگہ فساد کو انسانی اعمالِ بد کا ثمر قرار دیا ہے ورنہ اللہ تو اتنا کریم ہے کہ فرعون جیسے ظالم متکبر بدکار اور برائی کے نمونے کے پاس بھی انبیاء کو تاکید فرما کر بھیجا کہ اس سے بات نرم لہجے میں کیجئے گا اور اسے بھی موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو تیرا تزکیہ کر دوں تجھے واصل باللہ کر دوں۔ اللہ کے اس قدر قریب کر دوں کہ تجھے اس سے پیار آنے لگے یہاں نبی مبعوث فرمایا تو پیکر رحمت صلی اللہ علیہ وسلم جس کی بعثت ہی ساری انسانیت کے لیے تھی صرف ایک پہلو

پر غور فرمائیے کہ جب آپؐ مبعوث ہوئے تو ذرائع نقل و حمل آج کی طرح نہ تھے صدیوں بعد موٹر اور پھر جہاز کا دور آیا مگر اس تبدیلی نے زمین سمیٹ دی اور ساری انسانیت ایک کنبہ بن گئی ہے۔ آدمی صبح ایک ملک میں کرتا ہے تو شام دوسرے ملک میں۔ اگر آج یورپ میں نبی اور ہوتا اور ایشیا میں کوئی دوسرا تو آدمی کس کس سے دین کے ارکان کی تعلیم حاصل کرتا اور کیسے عمل کرتا مگر ضرورت بہت بعد میں آئی تکمیل کا سامان پہلے مہیا فرما دیا۔ اگر ذرا غور کریں گے تو یہی شفقت ہر سمت لٹتی نظر آئے گی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ قلب اطہر بخشا کہ کافر کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ اور یہ خیال فرماتے ہیں کہ میرے مبعوث ہوتے کے بعد بھی یہ بے نصیب بخشش سے محروم چلا جائے گا۔ ایذا دینے والوں کو دعا سے نوازتے ہیں اور دشمنوں تک کو اپنے احسانات سے محروم نہیں فرماتے۔

دوستاں را کجا کنی محروم ـ تو کہ با دشمنان نظر داری

پھر کوئی مشکل کام یا انہونی بات کرنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ جو کام کسی کے بس کا نہیں وہ اس کا ذمہ دار بھی نہیں ہاں جو کچھ کرنا چاہتا ہے وہ اس طریقے سے کرے جو اللہ کریم نے بتایا ہے اس لیے کہ وہ صحیح طریقہ ہے اور ہمیشہ صحیح طریقہ ہی سہل بھی ہوتا ہے پھر اس پر دائمی اور ابدی رضامندی بطور انعام بھی ہے لیکن اگر کوئی غلط روش اپنائے گا تو دنیا میں بھی مشکلات کا سامنا کرے گا اور ابدی زندگی بھی تباہ کرے گا۔ اسلام نے دنیا سے منع نہیں فرمایا بلکہ جس طرح ہر چیز کا موجد اس کے ساتھ طریقہ استعمال بتاتا ہے اور ہم زندگی بھر اس کی پابندی کرتے ہیں اس جہان کے خالق نے بھی اس کا طریقۂ استعمال ارشاد فرمایا ہے اور یوں اپنی رحمتیں لٹائی ہیں اور دین جسے نادانی سے ہم نے بوجھ سمجھ رکھا ہے ہماری انتہائی ضرورت ہے مگر اس کا احساس تب ہی ممکن ہے جب کوئی ذرہ معرفتِ باری کا نصیب ہو آدمی اپنے خالق کو اپنی حیثیت کے مطابق ہی سہی پہچاننے تو اگر یہ دولت نصیب ہو تو اللہ کریم سے محبت نصیب ہو جاتی ہے اور اس کی اطاعت اور یاد کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں رہتا ایک عجیب بات کہ اللہ کریم سے ڈرنے کا حکم ہے اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم بشارت دینے والے اور ڈر سنانے والے بھی ہیں تو میری ناقص رائے میں اردو کا لفظ ڈر مفہوم کو ادا نہیں کر پا رہا۔ دراصل اللہ سے ڈر اس بات کا کہ رابطہ خراب نہ ہو یہی محبت کی اک ادا ہے اور آپ کا مقامِ عالی کہ آدمی جو کچھ آج کر رہا ہے اس کے نتیجے میں جو نقصان قیامت

کے روز اس کے سامنے آئے گا اُسے مطلع فرماتے ہیں یہ ادا بھی شفقت بھری ہے۔ اللہ کریم اپنی اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و اطاعت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

آج ظہر کے بعد عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی رب جلیل کا شکر ہے کہ آسانی سے کر لیا۔ حرم پاک میں بدستور بھیڑ ہے کہتے ہیں آج کل سکول بند ہو جاتے ہیں اور ملک بھر سے عرب یہاں جمع ہو کر عمرے بھی کرتے ہیں، خرید و فروخت بھی اور یہاں کے مزیدار موسم کا لطف بھی اٹھاتے ہیں تو بھیڑ زیادہ ہو جاتی ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا پکنک منانے آجاتے ہیں، دوسرے علاقوں میں سردی شدید ہے تو میں سوچ رہا تھا کہ چلو پکنک ہی سہی مگر بیت اللہ کی زیارت نماز کی باقاعدگی اور طواف و سعی کے مزے بھی تو لوٹ رہے ہیں۔ اگر یہ پکنک ہی ہے تو بہت مبارک ہے۔

۲۳ جنوری ۱۹۸۹ء

کرنل صاحب کل جدہ تشریف لے گئے تھے۔ کینیا کا ویزہ نہیں لگا تھا کہ پتہ کر لیں وہاں سے اطلاع لائے کہ ان کا سفارت خانہ ریاض میں ہے لہٰذا پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کرنا پڑی کہ ہم پہلے ابوظہبی جائیں، وہاں سے ویزا لے کر کینیا اور کینیا سے سیدھے کراچی چنانچہ از سر نو پروازوں کا جائزہ لیا گیا اور اس کے مطابق پروگرام طے ہوا۔ اب دُعا یہ ہے کہ اللہ کرے اس کے مطابق جہازوں میں جگہ مل جائے۔

آج زیارات کا پروگرام تھا تقریباً ۹ بجے گھر سے احرام باندھ کر نکلے کچھ کاریں احباب کے پاس تھیں اور باقیوں کے لیے کرائے کی گاڑیاں حاصل کی گئیں یوں یہ قافلہ شوق جبل ثور کے دامن میں جا ٹھہرا نیچے سڑک سے اس چوٹی کی زیارت کی جس کی ظاہری بلندی بھی آسمان کو چھو رہی تھی اور مقام و مرتبہ جو اللہ نے اسے بخشا ہے اس میں بھی کوئی دوسرا شریک نہیں، شاید اس موضوع پر پہلے کئی بار لکھ چکا ہوں بس اپنی حالت پہلی سی نہیں کبھی غار ثور تک جایا کرتے تھے پھر آدھی پہاڑی چڑھ کر دعا کر لیا کرتے اور آج سڑک پر کھڑے کھڑے دامن پھیلا دیا، وہاں سے روانہ ہونے تو باہر سے ہوتے ہوئے مسجد نمرہ عرفات میں پہنچ گئے۔ سعودیہ نے سڑکوں کا جال بچھا دیا ہے اور ایک دوسری کو پلوں کے ذریعے اوپر نیچے سے اس طرح گزارا ہے کہ لاکھوں موٹروں کو بھی کوئی دقت نہیں ہوتی وہاں سے نکل کر جبلِ رحمت پر پہنچے دُعا کی۔ نیچے مسجد نمرہ تک میدان عرفات اب ہرے بھرے درختوں سے بھر چکا ہے۔ پھر مشعر الحرام آ کر رک کے اور منیٰ سے ہوتے ہوئے کوہ حرا کے دامن میں دُعا کی یہ سب کچھ یہاں پوچھے جانے والے اعمال کی تفصیل ارکین نو مسلموں کے لیے باعث حیرت تھی جو پہلے ہی بیت اللہ شریف کی عظمت اور مسلمانانِ عالم کے اجتماع سے حیران تھے۔ بغرض ظہر کی اذان ہوئی تو ہم عمرہ ادا کر چکے تھے۔ نماز ادا کر کے مکان پر آ گئے۔ آج صبح کے درس قرآن کا خلاصہ بھی عرض ہے تو پہلا آج کا موضوع ذکر الٰہی تھا۔

آیہ کریمہ جس کا مفہوم اس طرح سے ہے کہ اے ایمان والو اللہ کا ذکر کثرت سے کرو اور صبح و شام اس کی پاکی بیان کیا کرو، وہ تم پر رحمت نازل فرماتا رہتا ہے اور اس کے فرشتے تمہارے لیے طلب رحمت کرتے ہیں، تاکہ تمہیں ظلمت سے نور کی طرف نکالے اور مومنوں سے بہت رحم کرنے والا ہے اور جس دن اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ انہیں سلام تحفہ میں ملے گا اور ان کے لیے بہت بڑا اجر اور انعام ہے"

دو باتیں ہر معاشرے کی بنیاد ہوتی ہیں اول معاشی نظام اور دوسری نظریاتی اساس، اسلام کا معاشی ڈھانچہ اس بات پر استوار ہے کہ طلب رزق حلال اور کسب حلال فرض ہے مگر یہ فرض صرف کتابوں میں پڑھا پڑھایا جاتا ہے کسی تقریر میں بھی سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اور فکری بنیاد ہے یاد الٰہی کہ مومن ہر آن اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اللہ کی یاد سے دل کو روشن رکھے۔ ہماری بدقسمتی کہ ہم اسے بھی بڑی حد تک کھو چکے ہیں اور نماز روزہ یا تسبیحات یا تلاوت جو کبھی نصیب ہو جائے اسے ہی ذکر جان کر کافی سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اس حد تک یہ بات درست ہے کہ یہ سب بھی ذکر الٰہی ہے مگر اس سب کے ذکر الٰہی بنانے کے لیے زبانی ذکر کو اور عملی ذکر کو ذکر الٰہی بنانے کے لیے دل کا ذاکر ہونا شرط ہے۔ اگر دل ذاکر ہے تو پھر یہ سب ہی نہیں ہر عمل جو ہم شریعت کے مطابق کرتے ہیں ذکر ہے اور ہر کام جس سے شریعت روک دے نہ کرنا ذکر ہے اور اگر دل ذاکر نہ ہو تو یہ محض ضابطے کی کارروائی رہ جاتی ہے اس پر وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا جو واقعی ہونا چاہیئے مثلاً قرآن میں ارشاد ہے کہ نماز بے حیائی اور برائی سے روک دیتی ہے عجیب بات ہے۔ آج کے نمازی کا تو یہ حال نہیں اور یہی صورت حج اور رمضان یا تلاوت کی ہے اس لیے کہ ان سب کی روح ذکر قلبی ہے جس کا حکم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے موجود ہے کہ اپنے رب کے نام کی تکرار فرمایئے اور سیرت پاک میں وارد ہے کہ آپ ہر حال میں اللہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ آج کا مسلمان پوچھتا ہے کہ صحابہ کرام

ذکر کرتے تھے جن کے بارے میں اللہ کریم کی شہادت کتاب اللہ میں موجود ہے کہ ان کی کھالیں اور دل اللہ کا ذکر کرنے والے بن گئے یعنی کھال سے لے کر نہاں خانۂ دل تک ہر بال ہر ہڈی ہر قطرۂ خون ذاکر تھا۔ افسوس کہ آج ہم اس عظیم دولت سے خالی رسومات پر بڑ جھگڑ رہے ہیں اللہ کریم ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ ارشاد ہے کثرت سے اللہ کا ذکر کرو یعنی زندگی بھر جتنے کام کرو ان میں سب سے زیادہ جو کام کیا ہو وہ ذکر الٰہی ہونا چاہیئے اور ہر آن صبح و شام ROUND THE CLOCKE دن رات کرتے رہو اس لیے کہ اس کی طرف سے رحمت کی بارش برستی رہتی ہے اور اس کے فرشتے بھی مومنوں کے لیے طلب مغفرت کرتے ہی رہتے ہیں تاکہ تمھیں تاریکی سے خواہ وہ عقیدے یا نظریے کی ہو یا عمل کی بچا کر روشنی اور نور کی طرف لے جائے یعنی اُدھر سے کمی نہیں ہوتی تم غافل ہو جاتے ہو یعنی تمھارے قلوب ذکر سے خالی ہو جائیں تو قبولیت کی استعداد کھو بیٹھتے ہیں لہذا ہر آن اس کی یاد سے دل آباد رکھو کہ وہ تم پر بہت مہربان ہے اتنا مہربان کہ نہ صرف دنیا بلکہ حادثۂ قیامت اور حضوری بارگاہ کے وقت جب سب لرزاں و ترساں ہوں گے۔ مومنین کو سلامتی کے تحفے نصیب ہوں گے اور انعامات سے نوازے جا رہے ہوں گے۔ اللہ کریم ہمیں ذکر قلبی اور دوام ذکر کی دولت نصیب فرمائے۔ آمین

آج کا دن بھی گیارات کچھ ساتھی پاکستان سے اور بھی آ گئے تھے آج سب عمرہ کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے اب باقی کل انشاء اللہ

(جاری ہے)

اسرار التنزیل کی دوسری جلد چھپ چکی ہے

کیا آپ نے اس کی کاپی حاصل کر لی ہے ؟

پہلی اشاعت سے محدود تعداد باقی رہ گئی ہے، پتہ نہ ہو کہ آپ کو اگلی اشاعت کا انتظار کرنا پڑے

قیمت غیر مجلد /۵۰ روپے
مجلد آرٹ پیپر /۱۰۰ روپے

برکاتِ نبوت

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان

دنیا میں انسان کے پاس علم کے بہت عجیب ذرائع موجود ہیں جو اللہ کریم نے اسے عنایت فرمائے ہیں اور تخلیق انسانی میں ایسی ایسی عجیب قوتیں پنہاں تھیں کہ ان کے اظہار سے دنیا کا رنگ بدل گیا۔ آن واحد میں انسان کی نگاہ روئے زمین کو دیکھ لیتی ہے آن واحد میں دنیا کے دوسرے سرے تک کی بات سنی جا سکتی ہے۔ ایک بٹن دبا کر آپ آدمی کے سارے اندرونی نظام کو جان سکتے ہیں۔ اس کی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ ایک مشین کے سامنے کھڑا کر کے آپ آدمی کے ایک ایک نس، ایک ایک ہڈی اور ایک ایک عضا اور اس کی کارکردگی کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اور انسانی علوم نے کہاں تک ترقی کی ہے اور مزید خدا جانے کل جو ایجادات سامنے آنے والی ہیں۔ ان میں مزید کس قدر اور باتیں کھل کر سامنے آئیں گی۔ آج جو بات ہمیں زیادہ عجیب معلوم نہیں ہوتی اسے آج سے پچاس سال پہلے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ آج ہم ایک جہاز میں کم و بیش چار سو آدمی سوار ہوتے ہیں اور وہ چند گھنٹوں میں ایک براعظم سے دوسرے براعظم پہنچا دیتا ہے۔ آج سے سو سال پہلے جہاز کا نقشہ بھی کسی کے ذہن میں نہ ہوا ہوگا۔ تو شاید آئندہ پچاس برسوں میں یا سو برسوں میں انسان کیا کچھ ایجاد کر لے۔ لیکن ایک بات قطعی ہے کہ ان سارے کمالات کے باوجود انسانی کا سارا علم اندازہ اور تخمین پر موقوف ہے اور کسی بھی انسان کی کوئی رائے آخری رائے نہیں۔ کوئی تحقیق آخری تحقیق نہیں ہے۔ کوئی نتیجہ آخری نتیجہ نہیں ہے۔ ایجادات آتی ہیں اور ہم پھر سمجھتے ہیں کہ یہ تو کمال ہو گئی۔ لیکن سمجھ آتا ہے کہ اس میں کچھ نقص رہ گیا تھا۔ جو سامنے آ رہی ہے وہ اس سے زیادہ اچھی ہے۔ اسی طرح علوم کے ذرائع آتے ہیں۔ انسانی جسم کے متعلق تحقیقات آتی ہیں۔

آج ایک دوائی بنتی ہے بڑی محنت سے اور ۶ ماہ بعد، سال کے بعد اس کے متعلق آتا ہے کہ اس کے جو منفی نتائج ہیں وہ بہت زیادہ ہیں۔ اس کے سائیڈ ایفکٹس ( ) بے شمار ہیں۔ لہٰذا اس کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس سے نفع کم اور نقصان زیادہ ہے۔ اور یہ ایک مسلسل عمل ہے کہ باوجود مشینوں کی ایجاد کے باوجود جدید ٹیکنالوجی کے باوجود زیادہ ترقی کے انسان کسی بھی بات پر، کسی بھی کام پر، کسی بھی شعبہ زندگی میں کوئی آخری بات نہیں کہہ سکتا۔ اسلام وہ دین ہے اللہ کی کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بندوں تک پہنچائی۔ جس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آگے چلنے سے پہلے جیسے آپ سرورق کو کھولتے ہیں۔ تو پہلی بات جو اللہ کی کتاب آپ سے کرتی ہے کہ دیکھو "ذالک الکتاب لاریب فیہ" آگے چلنے سے پہلے یہ یقین حاصل کر لو کہ اس میں جو کچھ تم پاؤ گے وہ آخری بات ہے اس سے آگے کسی میں کوئی تبدیلی نہیں۔ اس کی کوئی اطلاع غلط نہیں ہے۔ اس کا کوئی تجزیہ کردہ نسخہ نقصان دہ نہیں ہے۔ اس

کوئی خبر مشکوک نہیں ہے اور جو نتائج اس میں بتاتے ہیں کہ فلاں عمل کا یہ نتیجہ ہوگا وہ قطعی یقینی ہے۔ اور طے شدہ ہے۔ یہ وہ بنیاد ہے جو قرآن حکیم پر عمل کی قوت فراہم کرتی ہے۔ اسی لیے شاید یہ آیۂ کریمہ اللہ جل شانہٗ نے سب سے پہلے سے لکھا دیا۔ کیونکہ قرآن کریم کی ترتیب نزول کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی ترتیب بھی منزل من اللہ ہے کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے اسے ترتیب دیا تھا۔ جو آیت جہاں جہاں اللہ کریم نے حکم دیا، وہاں وہاں رکھدی گئی تو یہ دروازہ ہے ہی جیسے ہی کوئی بندہ کتاب الٰہی کھولتا ہے سب سے پہلے اسے جو بات ملتی ہے کہ دیکھو میاں اگر تمہیں اس بات پر اعتبار نہیں آرہا تو تمہیں آگے جا کر کیا حاصل ہوگا۔ یعنی یہ شرط اسلام ہے کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ ایک ایک نسخہ، ایک ایک حرف، ایک ایک جگہ، ایک ایک نشر ہمارے یقین کا جزو بن جائے گی "ایمان کا حصہ ہے"۔ اب اس پر جتنا یقین کمزور ہو گا اتنی کمزوری ایمان میں آئے گی اور ایمان کی کمزوری جو ہے وہ عمل کو زیادہ

متاثر کرتی ہے۔ ویسے جو اعمال میں تنزلی آتی ہے یا اعمال میں خامی رہ جاتی ہے۔ یا اعمال میں کمزوری آتی ہے اس کے پیچھے وہ یقین کی کمزوری ہوتی ہے جو ہمیں اللہ کے ارشادات پر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر ہوتا ہے۔ جیسے ہم اپنا بھرم رکھنے کے لیے، اپنے آپ سے بھی چھپاتے ہیں۔ دوسرے پر ظاہر کرنا تو دور کی بات ہے۔ ہم اپنا تجزیہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنے ساتھ بھی کرتے ہیں۔ یعنی اپنے آپ سے بھی یہ بات ہم چھپانا چاہتے ہیں کہ یار یہ بات کہ آخرت کیسے ہوگی! حساب ہوگا! یہ جنت بھی ہے کہ نہیں ہے؟ لیکن یہ ہم علیحدہ سوچتے ہیں اور اپنی عملی زندگی اور اپنے خانگی زندگی اور اپنے معمولات الگ سے رکھتے ہیں۔ اس بات کو کھول کر اپنے آپ سے ر ڈسکس نہیں کرتے اپنے آپ سے بھی چھپانا چاہتے ہیں، حالانکہ اس کا علاج چھپانا نہیں ہے۔ یہ ایک مرض ہے، یہ ایک بیماری ہے — قرآن حکیم نے سب سے پہلے اس بیماری کو معاشرہ کی اسی بیماری کو چیلنج کیا ہے کہ اس سے نجات پا جاؤ تو سمجھو کہ تمہارے سامنے اللہ کا راستہ کھلا ہے، کتاب ہدایت تمہارے سامنے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی اور قوت تمہارے سامنے ہے۔

چلتے جاؤ تمہارا راستہ کھلا ہے تو پھر ہمیں یقین کیوں حاصل نہیں ہے۔ مجھے بہت سے احباب سے بہت سے معاشروں میں بہت سے حالات میں چلنے کی سعادت نصیب ہوتی رہتی ہے۔ میرے خیالات میں پاکستان میں بھی، برطانیہ میں بھی، امریکہ اور یورپ میں سب جگہ تقریباً الفاظ مختلف ہیں۔ لیکن بات ایک ہی ہے اور یہ بات صرف یہاں ہی نہیں ہے۔ پاکستان میں بھی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ معاشرہ ہمارے ساتھ تعاون نہیں کرتا۔ ہم پر معاشرہ کا اتنا دباؤ ہے۔ ہماری ضروریات، ہماری روزمرہ کی زندگی، ہمارے رشتہ دار، ہمارے کاروبار، ہماری، جائیداد، ہماری ملازمت، ہمارا یہ سب کچھ جو ہے یہ سارے سلسلے اس قدر پیچیدہ اور الجھے ہوئے ہیں کہ ہم انہیں اگر برقرار رکھتے ہیں تو اپنی زندگی کو پوری طرح سے اسلامی راستہ پر نہیں لا سکتے۔ اور اگر پوری طرح سے اس طرف آتے ہیں تو ادھر ہم اپنا نباہ نہیں کر سکتے۔ ہم کیا کریں؟ کدھر جائیں؟ اور اس بات میں بڑا وزن بھی ہے۔ کیونکہ معاشرہ جو ہوتا ہے۔ یہ ایک

روڈ رولر کی طرح ثریٹ ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی کنکر روڈ رولر کا راستہ روک نہیں سکتا۔ اسی طرح کوئی بھی اکیلا انسان معاشرہ کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے بھرے پُرے ملک میں ایک انسان ایک بات پہ اسٹینڈ لے اور پورا معاشرہ اس کے خلاف جا رہا ہو۔ تو وہ آدمی کیسے جائے گا۔ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ تباہ ہو جائے گا۔ اور .... ہوگا۔ یہ تب ہوتا ہے۔ جب وہ آدمی عام آدمی ہو۔ یہاں سے عام آدمی کا اور مسلمان کا فرق شروع ہو جاتا ہے۔ جب ہم اس جگہ پہنچتے ہیں تو اسلام اور غیر اسلام کی تفریق شروع ہو جاتی ہے۔ ہمیں اس بات کو سمجھنے کے لیے اس لمحہ کو دیکھنا ہو گا جب آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت فرمایا۔ تو آپ حضرات کے مطالعہ میں یہ بات آئی ہو گی کہ انسانیت کے ہزاروں انقلاب آئے لوگ بگڑے بھی لوگ سنورے بھی۔ قومیں اس حد تک بگڑی کہ تباہ ہو گئیں، برباد ہو گئیں، غرق ہو گئیں۔ پھر نئی آبادیاں بن گئیں۔ حالات سدھرے بھی ہیں۔ لیکن بین الاقوامی سطح پر، روئے زمین پر بیک وقت جتنے بگاڑ اس وقت موجود تھا۔ جب حضرت محمد مبعوث ہوئے اتنا بگاڑ تاریخ انسانی میں نہ اس سے پہلے کبھی نظر آتا ہے اور نہ

اس کے بعد کبھی ملتا ہے۔ بیک وقت بالاعتبار عقیدہ کے بالاعتبار عمل کے۔ بالاعتبار کردار اور سوچ کے۔ کسی بھی پہلو سے آئیں۔ سیاسیات کی طرف دیکھ لیں۔ حکومتوں اور حکمرانوں کے کردار کو دیکھ لیں۔ قوموں اور خاندانوں کے کردار کو دیکھ لیں تو جتنا ظلم، جتنی تباہی و بربادی۔ جتنا شرک جتنا کفر جتنے بدکرداری اس زمانے میں بیک وقت تھیں۔ کیا اس کا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، کیسا زمانہ ہوگا؟ کہ پوری زمین پر ایک آدمی بھی اللہ کا نام بتانے والا یا اللہ کے نام سے آشنا نہ تھا۔ پوری انسانیت میں کوئی پیشانی ایسی نہ تھی جو اللہ کی بارگاہ میں جھکتی۔ کوئی حلق ایسا نہیں تھا جہاں اللہ کے لیے آواز بلند ہوتی۔ کوئی قدم ایسا نہ تھا جو اللہ کی راہ میں اُٹھتا۔ ہم آج کہتے ہیں کہ آج بہت بگاڑ ہے۔ لیکن میرے بھائی! آپ دیکھیں اتنے دور دراز ملک میں اور اتنے بگڑے ہوئے معاشرے میں بھی آپ کے پاس اللہ کے بندے۔ اللہ کی کتاب لے کر اللہ کا نام لیکر، اللہ کے کام کیلئے پہنچتے رہتے ہیں۔ اس وقت کا اندازہ کر لیں جب کوئی چاہتا بھی تھا۔ روئے زمین کا سفر کر لیتا اس کو اللہ کا نام بتانے والا کوئی نہ تھا۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سیرت کی کتابوں میں ایک مشہور واقعہ ہے۔

بن طفیل مکہ کا رہنے والا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ یہ جو کچھ ہمارے اردگرد ہو رہا ہے۔ یہ جو ہماری قوم کر رہی ہے یہ سارا غلط ہے۔

یہ جو انہوں نے پتھروں کے بت بنا رکھے ہیں۔ ان پتھروں کے بتوں کو ہم خود تراشتے ہیں۔ تو ہمارے بنانے والے یہ کیسے ہو گئے؟ ہم نہ تراشیں تو یہ محض پتھر ہیں۔ ہم تراشتے ہیں تو یہ خدا بن جاتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ بندہ خدا بناتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ جہاں تک ممکن ہوا اس نے سفر کئے۔ یہود اور نصاریٰ کے پاس علماء بھی تھے، راہب بھی تھے۔ ان کے پاس بھی گیا۔ اس نے جب حقیقت پر بات کی تو انہوں نے کہا دیکھو میاں ہمارے پاس جو اللہ کی کتابیں تھیں وہ بدل چکی ہیں۔ ان میں تحریف ہو چکی ہے۔ ہمارے پاس قصے کہانیاں ہیں۔ حکایات ہیں۔ جو حقائق تھے وہ ہم کھو چکے ہیں۔ اگر تم بھی ان قصے کہانیوں میں الجھنا چاہتے ہو تو ہم تمہیں سکھا دیتے ہیں۔ لیکن اگر حقیقت جاننا چاہتے ہو تو حقیقت ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہم بھی نہیں جانتے کہ حق کیا ہے۔ اور کس طرح ہے۔ اللہ کی شناخت کیا ہے۔ اس کی عبادت کس طرح کرنی چاہیئے۔ وہ کس بات پر راضی ہے۔ وہ کس بات پر ناراض ہے۔

یہ بات ہم تک بھی نہیں پہنچ پائی۔ بہت پہلے کتابیں مسخ ہو چکی تھیں۔ پھر وہ بیت اللہ شریف میں بیٹھا رہتا تھا اور روتا رہتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ اس کارگاہ حیات کا کوئی بنانے والا ہے۔ اسے چلانے والا ہے۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ کیسا ہے؟ اس کی صفت کیا ہے وہ کس بات پر راضی ہوتا ہے یہ مجھے کوئی بتانے والا نہیں۔ یہ حال تھا اور یہ بھی تاریخ۔ اس بات پر گواہ کہ اکیلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے ایک بندہ نے کھڑے ہو کر اس معاشرہ کے پورے سائیکل کے سامنے ہاتھ کھڑا کر دیا کہ بس بھئی اب رُک جاؤ۔ اسلام تو شروع یہاں سے ہوتا ہے کہ اس پورے معاشرے کے پورے سائیکل کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ بھئی بہت ہو چکا تم بہت چل چکے۔ جو اس میں الجھنا چاہتا ہے۔ وہ اُسے چلتا رہے گا۔ لیکن جو اس میں سے نکلنا چاہتا ہے کہ میرے دامانِ رحمت سے وابستہ ہو معاشرے میں بھی بہت بڑی قوت ہے۔ لیکن اس معاشرے کا بنانے والا اس سے مضبوط تر ہے۔ آؤ میں تمہیں اس کی پناہ میں لے جاتا ہوں۔ دیکھیں نا کتنے مزیدار الفاظ حضور نے فرمایا جب پوری دنیا میں کوئی کسی کا حال سننے والا نہیں تھا۔

ترجمہ:۔ لوگو اس معاشرے سے بیزاری کا اعلان کر دو"۔ اسے کہہ دو کہ ہمارا معبود اللہ ہے۔ اس کی ساری مصیبتیں اس کی جھولی میں ڈال دو۔ پھر دونوں عالم کی فلاح لو۔ اس کے ساتھ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ یہ صرف نرا اعلان نہیں ہے یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اتنے عظیم انقلاب کی بنیاد پڑ جاتی ہے کہ جس نے واقعی معاشرے کے اس سائیکل کو صرف روکا نہیں۔ اسے توڑ پھوڑ کر اس کے سارے رعب اور سارے جبر و استبداد مٹا کر اللہ کی زمین پر اللہ کا نام بلند کیا اور امن و امان قائم کیا اور ایک ایسا سورج طلوع ہوا کہ جہاں کوئی ظلم کرنے والا نہیں تھا کوئی مظلوم فریادی نہیں تھا۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دوران طواف
ایک ادھیڑ عمر خاتون کو دیکھا۔ اس کی بغل میں ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی اور وہ طواف کر رہی تھی۔ تو میں نے پوچھا بی بی تم یہ پوٹلی کیوں اٹھائے ہوئے ہو۔ کہنے لگی کہ کھو نہ جائے میں تو اکیلی ہوں، میرے ساتھ کوئی آدمی نہیں۔ جس کے پاس رکھ دیتی۔ مجھ سے کہیں کھو نہ جائے دیہاتی ہوں۔ میں نے سوچا اٹھا کر ہی طواف کر لوں۔ میں نے پوچھا کہاں سے آئی ہو۔ کہا "حضرموت" سے۔ کون تھا تمہارے ساتھ۔ اس نے کہا میرا اللہ میرے ساتھ تھا۔ میں نے کہا واپس کیسے جاؤ گی۔ اس نے کہا اللہ کے آسرے پہ واپس جاؤں گی۔ نہیں راستے میں کوئی خطرہ نہیں۔ کہا نہیں۔ دیکھیں کس معاشرے میں اسلام کی ابتدا ہوئی اور آپ اس معاشرے کو لیکر کہاں پہنچے۔ تو کیا یہ کمالات، یہ برکات، صرف مختص تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یا ان میں کوئی حصہ مسلمانوں کا۔ آپ کے امتیوں کا۔ آپ کے ماننے والوں کا بھی تھا۔ دیکھئے میرے بھائی۔ حضور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آپ پر نبوت اپنے کمال کو پہنچی۔ اور آج بھی وہ نبی ہیں۔ جو بیک وقت ساری انسانیت کیلئے اور سارے زمانوں کے لیے نبی ہیں۔ اسی لیے آپ کے بعد کسی نئی نبوت کا تصور نہیں۔ حضور اکرمؐ نے جہاں اللہ کی کتاب اس کے معنی و مفاہیم لوگوں تک پہنچائے۔ اسی تعلیمات محمدؐ کے ساتھ ایک اور کام بھی تھا، کتنا عجیب پہلو ہے۔ برکات محمدؐ۔ میرا ذاتی خیال ہے اور جہاں تک میری کمزور نگاہ پہنچتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم سے یہ پہلو چھوٹ رہا ہے۔ ہم تعلیمات پر پہنچ کر اس زمانے میں رک جاتے ہیں۔ آدھا حصہ لے لیتے ہیں اور آدھا حصہ جو زیادہ ضروری ہے وہ چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اسکے کہ پہلے زمانے کی نسبت آج تبلیغ زیادہ ہوتی ہے۔ پہلے زمانے کی نسبت آج تبلیغ کے ذرائع زیادہ ہو گئے ہیں، ریڈیو ٹیلیویژن اخبار، بیشمار ایسے ذرائع ہیں جو پہلے نہیں تھے۔ اس کے ساتھ بیشمار ایسے جائد ہیں۔ روزانہ کے اخباروں میں کچھ نہ کچھ دین کے متعلق ہوتا ہے۔ ہفتہ وار دینی رسالے۔ ماہنامہ دینی رسالے، میگزین جیسے کیا کچھ ہوتا ہے لیکن ہر طلوع ہونے والا دن صرف یہاں بلکہ میرے خیال میں ہمیں ہر جگہ پہلے سے دو قدم پیچھے پاتا ہے۔ اور جہاں تک اس . . . . اٹھتا ہے۔ وہاں آنے والی نسل وہاں تک نہیں پہنچتی۔ بلکہ پیچھے رہ جاتی ہے۔ وہ یقین وہ عزم اور وہ ہمت نہیں آتی۔ یہ اس لیے کہ دوسرا پہلو یہ تھا کہ جو بھی ایمان لا کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالی میں پہنچا۔ وہ بیک نگاہ صحابی ہو گیا۔ یعنی صبح کے وقت ایسی تبدیلی آئی اسکے اندر ایسی کچھ تبدیلی آگئی کہ وہ ایمانیات، عقائد، تیقن، دیانت امانت اور تمام اخلاق حسنہ میں تمام اعلیٰ اخلاق میں اس درجہ پہ پہنچ گیا جو نبوت کے بعد افضل ترین درجہ ہے اور جو صحبت عالی میں نہیں پہنچ سکا وہ نیک بھی بن سکا۔ عالم بھی بن سکا، جہاد بھی کر سکا غازی بھی بن سکا۔ شہید بھی بن سکا، سب کچھ کر سکا۔ لیکن صحابی نہیں بن سکا۔ صحابی بننے کے لیے صحبت عالی کی حاضری ضروری تھی۔ اور یہی وہ لوگ تھے جن کے ذمہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مشن لگایا تھا کہ جو حاضر ہیں وہ ان تک میری بات پہنچا دیں جو یہاں حاضر نہیں ہیں۔ یہیں سے یہ انفرادی خصوصیت بھی امت کو ملی کہ ہمیشہ انبیاء مبعوث ہوتے رہے۔ تبلیغ کیلئے لیکن آپ کی بعثت نے نبوت کو مکمل کر دیا اور یہ عزت آپ کی امت کے حصہ میں آئی۔ لیکن یہ حکم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنہیں دیا وہ صحابہ تھے۔ کیونکہ جو مجلس عالی میں پہنچا وہ صحابی ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ براہ راست رسول اللہؐ کا حکم جنہیں ملا وہ دو طرح کے تربیت یافتہ تھے۔ تعلیم نبوت بھی ان کے پاس تھیں اور برکات نبوت بھی ان کے سینے میں تھیں اور انہوں نے جنہیں پہنچایا وہ سارے تابعی کہلائے۔ جیسے جب صحابی کی ملاقات اور زیارت نصیب ہو گئی۔ زیارت یا صحبت کے طفیل ان کے اندر ایسی برکات آگئیں کہ ان برکات کا اس کا خاصہ یہ تھا کہ یہ اعلان جو اللہ نے فرمایا تھا کہ "ذالک الکتاب لاریب فیہ" اسے صرف سن کر ہی انہیں یقین کا وہ درجہ حاصل ہو جاتا تھا کہ ساری عمریں صرف کر کے بھی ہمیں اس کا کوئی حصہ نہیں مل رہا ہم جہاں تک ہماری زبان ساتھ دیتی ہے۔ ہم اس کے ماننے کا اقرار کرتے رہتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے عمل اور کردار کا تعلق ہے وہ کہتا ہے ہم نے کوئی نہیں مانا۔ پیسہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے تو ہم حرام کا بھی لے لیتے ہیں۔ اذان ہوتی ہے تو ہم مسجد سے کے لیے بھی چل پڑتے ہیں۔ موقع آتا ہے تو ہم جھوٹ بھی بول لیتے ہیں۔ دوسری دفعہ ہم شہادت بھی پڑھ لیتے

یعنی اس طرح سے گڈمڈ ضروری ہے۔ ہماری زندگی کہ گناہ کرنے سے، جھوٹ بولنے سے، غلط کرنے سے ہمارے پلے سے کچھ جاتا نہیں ہے۔ نیکی کرنے سے ہمارے پلے کچھ پڑتا نہیں ہے۔ لیکن یہ جو فیضان رحمت تھا۔ اس میں زیر و بم ہوتا تھا۔ آپ نے دیکھا تھا کہ حضرت بلال رضی کی پوری تاریخ میں یہ ملتا ہے کہ انسان تھے وہ بھی۔ کسی صحابی سے اگر کوئی کوتاہی ہوگئی تو وہ چیختا چلاتا حضور کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا کہ یا رسول اللہ مجھ سے یہ غلطی ہوگئی۔ اس کی مجھے سزا دی جائے۔ جو بھی تاوان مجھ پر آتا ہے میں ادا کر دوں گا۔ ایک جہاد پہ کچھ لوگ رہ گئے، نہ پہنچ سکے نہ جا سکے۔ تو حضور پلٹ کر آئے تو انہوں نے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ رکھا تھا کہ ہمیں جانا چاہیئے تھا ہم نے سستی کی۔ ہم نہیں گئے۔ ہمیں یہاں ستونوں سے باندھ دو۔ حضور نے فرمایا تم نے اپنے ساتھ زیادتی کی۔ اگر تم فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیتے تو میں تمہیں معاف کر دیتا۔ چھوڑ دیتا۔ تم نے اللہ کے دروازوں پر باندھ دیا۔ اپنے آپ کو۔ اب تم جانو اور اللہ تعالے جانے۔ تو کتنے دن ۲۸، ۲۹ دن انکو نماز کے وقت کھولتے تھے لوگ، نماز پڑھ لینے کے بعد ان کو پھر باندھ دیتے تھے کہ تم نے خود اپنے آپ کو باندھا کر لیا ہے۔ انہوں نے کیوں اپنے آپ کو اللہ کے دروازے پہ باندھ دیا۔ اتنی بڑی بات تو نہیں ہوئی تھی۔ جہاد پر تین سپاہی نہ اگر پہنچ پائے تو اللہ معاف کر دینے والا ہے۔ حضور نے فرمایا کہ تم مجھ سے معافی مانگ لیتے۔ میں تمہارے لئے اللہ سے معافی مانگ لیتا۔ لیکن انہیں محسوس ہوا کہ ہم نے کچھ کھو دیا ہے ہم نے کچھ ایسی غلطی کی ہے کہ ہم سے کچھ ہمارے پلے سے شاید کچھ ضائع ہو رہا ہے۔ ہمیں وہ حاصل کرنا چاہیئے۔ ہم نے اپنے بھائی کو کہہ دیا کہ اللہ کا یہ دین یہ عبادت سب ادھاری مزدوری ہے۔ یہ آخرت میں ملے گا۔ بھئی یہاں اگر نہیں ملتا تو یہ آخرت میں کیا ملے گا۔ اللہ تو بندے کو کہتا ہے جو عاجز ہے کہ کسی سے ادھاری مزدوری نہ کراؤ۔ اسے پسینہ خشک ہونے سے پہلے اجرت دیدو۔ اور خود ساری زندگی لوگوں سے ادھار کرتا ہے کہ تم ساری زندگی ادھار کرتے رہو۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ ایک بار کا سجدہ، ایک رکوع، مسجد کی طرف چلنے والا ایک ایک قدم ایک کیفیت عطا کرتا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ وہ اندرونی درد، احساس اور جذبہ ہو جو برکات صحبت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوتی ہوں

اور یہی برکات صحابہ نے تابعین کو اور تابعین نے تبع تابعین کو تقسیم ہوئیں اور یہ دو متوازی شعبے آج تک اسلام میں چلتے تھے ہمارے ہر مبلغ نے ہر واعظ نے ہمارے ہر عالم نے بلکہ یہ ہماری تبلیغی جماعت جو ہم میسر ہے ہیں اس کی بنیاد حضرت مولانا الیاس نے رکھی وہ خود بہت بڑے اہل اللہ تھے۔ یہ اہل اللہ کے لگائے ہوئے پودوں کا ثمر تھا۔ ان کے ارادوں کی گہرائی ہے کہ اتنی دنیا کو بدل چلا دیا کہ اس پہ اک زمانہ متحرک ہو جاتا ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے۔ آپ کسی سے کیا وہ انسان نہیں تھے۔ ہمارے جیسا انسان ہے قد میں چھوٹا نہیں ہے۔ یہ کس لیے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے بزرگوں کی محفل میں بیٹھ کر وہ برکات نبوی حاصل کی ہیں۔ جس دل سے وہ سوچتا ہے وہ انوار نبوت سے روشن ہے اس کی سوچ میں جو تیقن الٰہی اسے کتاب الٰہی سے حاصل ہے وہ برکات صحبت نبوی سے مزین ہے۔ اس کے ارادے یقین میں فرق ہے اس کے ہمارے ارادے میں فرق ہے۔ اس کے اور ہمارے سوچ میں فرق ہے۔ یہاں آکر ہمیں

ہم نے اپنے آپ کو زیادہ تر اور اپنے آپ، میں اپنے آپ کو کافی سمجھ لیا۔ صرف دین کے لیے دنیا کے لیے نہیں۔ دنیا کے لیے ہر دروازے پہ دھکے کھانے کے لیے تیار ہیں۔ دنیا کے لیے ہم چپراسی بن جاتے ہیں۔ مزدور بن جاتے ہیں۔ خاکروب بن جاتے ہیں۔ ڈرائیور بن جاتے ہیں۔ بگاڑ بن جاتے ہیں۔ لوگ سوتے ہیں، کافر سوتا ہے مسلمان تنخواہ لے کر اس کے دروازے پر پہرہ دیتا ہے یہ برداشت کر لیتا ہے۔ دین کے لیے کسی دیندار کے پاس چند لمحے بیٹھ کر اللہ اللہ سیکھنے کیلئے کچھ نہیں کرتا۔ اس کے پاس وقت نہیں تھا اس کے لیے ہم فاضل ہوتے ہیں۔ میں خود جانتا ہوں۔ میں پہلے سے جانتا ہوں۔ دنیا کے چند سکے کمانے کے لیے کافر کی غلامی کر لیتے ہیں۔ لیکن اللہ کی محبت، نبی کی برکات پانے کے لیے کسی صالح صحبت کی تلاش کی کوشش نہیں کرتے۔ تو میرے بھائی جب تک یہ برکات نبوت اور ان کی روشنی دل میں نہ آئے وہ قوت یقین حاصل نہیں ہوتی جو انقلاب آفرین ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات پانے کے لیے کسی صالح صحبت کی تلاش نہیں کرتے۔ تو میرے بھائی جب تک یہ برکات نبوت اور ان کی روشنی دل میں نہ آئے وہ قوت یقین حاصل نہیں ہوتی جو انقلاب آفرین ہوتی ہے۔ اور اگر وہ قوت نصیب نہ ہو تو آدمی

زندگی بسر ڈگمگاتا تو رہتا ہے۔ اللہ کریم ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ ہمارے گناہوں کو معاف کرے ہماری ٹوٹی پھوٹی نیکیوں کو قبول فرمائے۔ عالم اسلام کو غفلت سے آشنا کرے۔ لیکن ہم اپنے ساتھ۔ عالم اسلام کے ساتھ۔ اپنی آئندہ نسل کے ساتھ انصاف نہیں کر رہے۔ ان برکات کو پہنچاتے ہیں۔ یہ ہمارے ذمہ ہے جس طرح ہم سے پہلے بزرگوں نے اہل اللہ کو تلاش کیا یہ ہماری غفلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل اللہ کے نام پر نقالوں نے دکانیں سجا لیں۔ لوگوں کو لوٹ کر کھا گئے۔ اہل اللہ کے نام پر لوگوں نے مختلف رسومات جاری کر لیں۔ ہم نے اس کا علاج یہ سوچا کہ اس طرف سے ہم آنکھیں ہی بند کر لیں۔

بھئی ایک طرف ڈاکہ پڑھ رہا ہے اور آپ کہتے ہیں اس طرف کی کھڑکیاں بند کر لو۔ کیا وہ ڈاکو چھوڑ دیں گے؟ لوٹنے سے کہ وہ نہیں دیکھ رہا ہے۔ چھوڑ دو۔

اس کا علاج تو یہ ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے۔ اگر اس شعبہ میں کچھ لوگوں نے زیادتیاں کی ہیں تو حق تو یہ تھا کہ اس شعبہ کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی۔ اس کی حفاظت کی جاتی اور صاف ستھری نتھری جو بات تھی اسے ایک ایک آدمی تک پہنچائی جاتی۔ تاکہ اگر اس پہلو سے اگر کوئی آدمی زیادتی کرتا ہے یا غلطی کرتا ہے تو اس کا تدارک ہوتا۔ لوگوں کو حق بانٹتا۔ وہ سیدھی بات پہنچانا چاہتا ہوں۔ پوری قوت اور پورے اعتماد کے ساتھ کہ قرآن صرف واحد اکیلی کتاب ہے۔ جو بات کہتی ہے پورے یقین کے ساتھ کہتی ہے۔ اس کی ہر بات حتمی اور یقینی ہوتی ہے، ناقابل تقسیم۔ لیکن اس یقین کو دل میں اتارنے کیلیے برکات نبوت کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کوئی شخص از خود ان برکات کو اپنے اندر نہیں سمو سکتا۔ جس طرح تعلیمات نبوت صحابہ سے تابعین۔ تبع تابعین، نسلاً بعد نسلاً علماء سے مدارس سے کتابوں سے نقالوں سے ہم تک پہنچی ہیں۔ اس طرح برکات نبوت و صحبت سینہ بہ سینہ اہل دل سے۔ بزرگان سلاسل سے ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہیں اور جب تک اللہ نے چاہا یہ رہے گی کیونکہ یہی دین آخری دین ہے اور یہ دین اپنی مکمل صورت میں جب تک رہے گا۔ یہ عالم رنگ و بو قائم رہے گا اور جب اللہ کا نام دنیا میں لینے والے نہیں رہیں گے تو اللہ کا نام اٹھا لیا جائے گا۔ تو پھر اس دنیا کی عمر بھی پوری ہو چکی ہوگی۔ یہ آخری امت ہے۔ اسکے بعد کوئی نئی امت نہیں آئے گی۔ اللہ کریم ہمیں دین کی سمجھ اس پر عمل کی توفیق نبی کریم کا صاف ستھرا علم۔ آپ کی خالص برکات صحبت اور انوارات نصیب فرمائے۔

و آخری دعونا ان الحمد للہ رب العالمین ۔۔۔

Phone: 525736

WAHID JEWELLERS

FOR

QUALITY GOLD JEWELLERY

4, SAIGAL MARKET,
ZAIBUNNISA STREET,
SADDAR, KARACHI.

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان

موت

ہے آغازِ زندگی

مذاہب باطلہ نے جب انسانی عبادات کے ساتھ کسی طرح دنیوی انعامات کو جوڑنے کی کوشش کی تو فلاسفہ نے جس کی کوئی عقلی دلیل نہیں بنتی تھی اور منطقی طور پہ وہ چیزیں ان پہ درست نہیں بیٹھتی تھیں۔ فلاسفہ نے سرے سے مذہب کا انکار کر دیا اور قدیم فلاسفہ کا مذہب کے بارے میں یہ خیال تھا کہ یہ محض لوگوں کو کسی ایک راہ پہ ڈالنے کے لیے یا لوگوں کو کسی ایک مرکز پہ جمع کرنے کے لیے اور ان سے کوئی کام لینے کے لیے ہے۔ جس طرح کوئی سیاسی تحریک چلائی جاتی ہے اسی طرح کا کوئی نعرہ یا کوئی مشن یا کوئی دعوہ دے کر مذہب کی تحریک بنائی گئی ہے۔

اس کی بنیاد اس بات پہ تھی کہ فلاسفہ موت کو انسانی زندگی کا اختتام سمجھتا ہے۔ یہ سارے کو سارا فلسفہ انسان کی موت پر توڑ دیتا ہے اور موت کے بارے فلاسفروں کی آج تک رائے یہ تھی کہ انسانی وجود میں روح قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ انسانی جسم میں جو اجزاء ہیں، خلیے ہیں، مختلف حصے ہیں ان کے ایک خاص نسبت کے ملنے کی وجہ سے زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب اُن کی وہ نسبت درست نہیں رہتی تو بیماری آجاتی ہے اور اگر اس میں زیادہ بیگاڑ آجائے تو زندگی کے آثار ختم ہو جاتے ہیں لہذا اسے موت آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کا کوئی اور تصور فلسفے کے پاس نہیں ہے۔ موت پہ زندگی ختم ہو گئی۔ سائنس کی جدید تحقیق فلاسفہ کو بھی سوچنے پہ مجبور کر رہی ہے کہ یہ کلیہ غلط ہے۔ کیونکہ آج کل اعضاء کی پیوندکاری کا جو نیا دروازہ کھلا ہے اس میں یہ بات آگئی ہے مثلاً مرنے والے کی آنکھ لے لی جاتی ہے۔ وہ خیرات کر دیتا ہے کہ دوسرے کو لگا دی جائے۔ اب وہ آنکھ مرنے والے کے جسم میں تھی، تو دیکھ نہیں سکتی تھی۔ لیکن کسی زندہ کے جسم میں جب وہ آنکھ لگائی جاتی ہے وہی آنکھ دیکھنے لگ جاتی ہے۔ تو اس میں فلاسفہ کے اس قول کو سائنس نے اس قول کو کہ اعضاء میں یا خلیوں کے نسبت میں کوئی فرق آگیا اسے غلط ثابت کر دیا۔ آنکھ میں تو دیکھنے کی استعداد موجود تھی۔ کوئی ایسی چیز تھی جو اس بدن میں سے چلی گئی اور جس بدن کے ساتھ اسے اب جوڑا گیا اس میں وہ موجود ہے۔ جس کی وجہ سے وہ دیکھنے لگ گئی۔ لیکن یہ بھی ان کے پاس صرف اس بات کی دلیل ہے کہ بدن کے علاوہ بدن کے اندر کوئی چیز ایسی ہے جو اسے حیات بخشتی ہے۔ وہ کیا ہے وہ کیسی ہے اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں

جو انکار کرتے ہیں، وہ انکار پہ قائم نہیں رہ سکتے۔

لیکن اس سے آگے کہ وہ اقرار کریں یا اس کی کوئی وجہ تعیین کریں لیکن ابھی تک ان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے کیونکہ یہ موضوع ایسا ہے کہ اس کا تعلق ان فنون سے ہے جو الٰہیات سے ہیں۔ الٰہیات ان علوم کو کہا جاتا ہے جو ذات باری، صفات باری سے متعلق اور جن کا حصول بھی براہ راست ذات باری سے ممکن ہو۔ اس کے علاوہ کوئی مدرسہ، انسان کی عقل، کوئی عقلی کاوش، کوئی محنت، کوئی طریقہ انہیں سیکھنے کا نہیں ہے۔

وہ علوم براہ راست اللہ کی طرف سے سکھائے جاتے ہیں ان کو سیکھنے کے لیے نور نبوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام وہ مقدس ہستیاں ہیں جو براہ راست اللہ کریم سے علوم حاصل کرتی ہیں اور اللہ سے لیکر مخلوق تک پہنچانا یہ انکی اہم بات ہے۔ کام بھی ہوتا ہے اور نبوت کے فرائض میں سے بھی ہے ان کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے اور یہی بہت بڑی نعمت اور بہت بڑا عظیم احسان بھی ہوتا ہے۔

سو اس موضوع کو جب کبھی بھی کوئی سمجھنا چاہے تو اُسے چاہیئے کہ وہ ارشادات نبوت کی روشنی میں اسے سمجھے تو شاید اس پر منکشف فرما دے۔ بات کا کوئی سرا اس کے ہاتھ میں آ جائے۔ اس سے ہٹ کر اگر ہم اس پہ عقلی دلائل اور اپنے زور بیان صرف کرنے لگ جائیں تو نتیجہ سوائے انکار کے یا الجھنوں کے یا مشکلات کے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمارے آج کے زمانے کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ خود مسلمانوں کے اندر موت کے بارے میں بے شمار راستے پیدا ہو چکے ہیں۔ عذاب و ثواب کے بارے میں متعدد آراء پیدا ہو چکی ہیں ان سب کی بنیاد انسانی فکر پر، انسانی عقل پر ہے آپ اسے فلسفہ کہہ لیں، آپ اسے سائنس کہہ لیں۔ لیکن آپ اسے دین نہیں کہہ سکتے۔ دین کہنے کے لیے آپ کو ثابت کرنا ہوگا کہ یہ بات اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہے اور ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں کبھی التضاد نہیں ہوتا اس طرح کی جتنی آرائیں جن پہ آج بڑے معرکے ہوتے ہیں۔ بڑے زور شور سے بیان کیا جاتا ہے عجیب و غریب دلائل دیئے جاتے ہیں۔ ثابت یہ کیا جاتا ہے کہ موت کوئی ایسی حقیقت ہے جو کم از کم اس دنیا سے انسان کو قطع تعلق کرا دیتا ہے۔ پھر روح اور بدن کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اس لیے کہ جب وہ سوچتے ہیں کہ بدن کو سڑ جاتا ہے بعض اوقات بدن جل جاتا ہے۔ بعض اوقات بدن کو درندے کھا جاتے ہیں۔ تو یہ جو عذاب و ثواب کا فلسفہ ہے بدن دوبارہ زندہ نہیں ہوگا روح کے ساتھ اسے دوبارہ نئی زندگی نصیب نہیں ہوگی۔ تو اسے عذاب کیسے ہوگا۔ وہ تو کسی درندے کے وجود کا حصہ بن گیا ہے۔ یا کسی اور شے کا وجود بن گیا یا وہ مٹی کے اجزاء بن کر کسی درخت کا حصہ بن گیا کسی اور صورت میں وہ مٹی چلی گئی تو یہ بہت مشکل ہے قبریں بھی کھلتی جب روز ہم دیکھتے ہیں ان میں تو کچھ نہیں ہوتا نہ عذاب ہوتا ہے نہ ثواب ہوتا ہے۔ چند فرسودہ ہڈیاں ہوتی ہیں۔ یہ کیسے مانا جائے کہ ان میں عذاب ثواب ہو رہا ہے۔ تو یہ ساری باتیں جمع کرنے کے بعد نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اس بدن سے بھی کوئی تعلق نہیں رہتا۔ یہ قبر وہ قبر نہیں ہے وہ قبر کوئی اور ہے۔ عذاب و ثواب کا انکار کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے کہہ دیا جاتا ہے کہ کوئی مثالی بدن روح کو دے دیا جاتا ہے۔ اسے عذاب و ثواب ہوتا ہے پھر قیامت قائم ہوگی۔

اگلے دن میں نے ایک بالکل نئی بات پڑھی جو آج تک کم از کم میں نے نہیں پڑھی تھی۔ وہ مولانا طاہر القادری صاحب کی بات تھی۔ انہوں نے ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ پتہ نہیں کہاں سے پڑھا ہے انہوں نے، کہ انسان کی ایک پہچان ہوتی ہے جسے انہوں نے المیت کا نام دیا ہے ایک شناخت ہو جاتی ہے۔ آدمی اپنے آپ کو پہچان لے کہ میں فلاں آدمی ہوں۔ اب یہ ضروری تھوڑا ہے کہ آخرت میں وہی وجود زندہ کیا جائے اسی کو عذاب دیا جائے۔ کوئی بھی وجود ہو جائے۔ اللہ اس کو وجود دیدے اور اپنے آپ کو پہچان لے۔ یہ آج تک میں نے کسی سے نہیں سنا۔

یہ اتنی ہی بعید از انصاف بات ہے کہ اللہ کریم سے کم از کم اس کی امید رکھنا ایمان کے منافی ہے۔ جرم کرنے کے وقت کوئی اور وجود ہو اور سزا پانے کے لیے کوئی اور وجود دے دیا جائے اسے اللہ کا انصاف تو نہیں کہا جا سکتا۔ یہی اعتراض تو ہم جسم مثالی پہ کرتے ہیں کہ جو حضرات یہ فرماتے ہیں کہ مرنے کے بعد یہ جسم تو مٹی کھا گئی۔ روح کو جسم مثالی ملتا ہے۔ اگر نیک ہو تو ثواب جسم مثالی کو ہوتا ہے اگر عذاب ہو تو جسم مثالی کو ہوتا ہے۔

ہم یہی تو عرض کرتے ہیں کہ حضرت اس جسم مثالی غریب کا قصور کیا ہے کہ اسے عذاب دیا جائے یا اس نے کون سا مجاہدہ کیا جو اسے ثواب ملتا ہے۔ آپ سردی میں اس جسم کو اٹھاتے ہیں۔ وضو ٹھنڈے پانی سے یہ جسم کرتا ہے میدان جہاد میں یہ جاتا ہے زخم یہ کھاتا ہے۔ سجدے یہ کرتا ہے۔ اور اس کا بدلہ لینے کے لیے ایک اور جسم پیدا کر دیا جاتا ہے۔ اور انعام اسے دیا جاتا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ جرم یہ وجود کرتا ہے لذت یا تکمیل خواہش اس اس جسم کو حاصل ہوتی ہے اور عذاب کے لیے کسی اور کو پکڑ کر سزا دے دی جاتی ہے کسی اور کو اسی وقت پیدا کر کے سزا دے دی جاتی ہے یہ کہاں کا انصاف ہے۔

پھر ایک قانون ہے اللہ کا قرآن حکیم میں کہ جس کی طرف رسول مبعوث نہیں ہوتا اسے عذاب نہیں دیا جاتا جیسے انسانیت کی طرف انبیاء مبعوث ہونے یہ مکلف ہیں جواب دہ ہیں۔ لیکن اگر نبی مبعوث نہ ہوتے تو شاید قیامت کو انسانوں کو جواب بھی نہ دینا ہوتا۔

تو جسم مثالی غریب نہ دنیا میں آیا نہ اس کی طرف کوئی نبی مبعوث ہوا نہ اس کے لیے کوئی حکم نازل ہوا نہ اسے اسلام کی دعوت دی گئی اسے عذاب کس بات کا ہے۔

یہ عجیب سا فلسفہ ہے کہ کوئی وجود دے دیا جائے اور اسے صرف پہچان ہو کہ میں فلاں آدمی ہوں۔ اور یہ ایک نظریہ ہے جو بالکل لایعنی سا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو ارشادات نبوت کی روشنی میں سمجھنا چاہیئے ورنہ ہماری عقل اسے حل نہیں کر سکتی۔

قرآن حکیم نے اسے بڑے سادہ سلیس اور عام فہم الفاظ میں فرمایا ہے۔ صفات باری بیان کرتے ہوئے فرمایا وہ ایسی عظیم ذات ہے۔ وہ ایسا عظیم خلاق ہے وہ ایسا صانع ہے وہ ایسا کاریگر ہے کہ اسی نے رات کو بھی پیدا فرمایا۔ دن کو بھی پیدا فرمایا۔ رات کی تاریکیوں کا بھی خالق وہی ہے۔ اور جو کچھ تاریکیوں میں ہوتا ہے اس سے بھی بے خبر نہیں ہے۔ وہ بھی اس کی گرفت سے باہر نہیں ہیں۔ یعنی تاریکی آپ کو بے بس کر دیتی ہے۔ اللہ کو نہیں وہ خود خالق ہے۔ رات بنائی، رات کی تاریکی بنائی اور پردہ شب پہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ جو کچھ پردہ شب میں ہوتا ہے اس کے دست قدرت سے دور نہیں۔ اس کے علم سے زائد نہیں ہے۔ اس کی پہنچ سے باہر نہیں ہے۔ اس کے لیے جس طرح دن کا دامن کھلا ہوا ہے اسی طرح رات بھی اس کے سامنے واضح ہے اس کے لیے رات اور دن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح دن اس کی مخلوق ہے۔ اسی طرح رات بھی اس کی مخلوق ہے یعنی اگر رات دن کی نسبت مشکل نظر آتی ہے۔ تو وہ ہمیں نظر آتی ہے۔ ہم آنکھ بند کر کے سو جاتے ہیں۔ ہم مسلسل دو راتیں نہیں جاگ سکتے۔ یا ہمیں رات کو نظر نہیں آتا ہمارا کوئی سامان چرا لیتا ہے یا کوئی ہمیں لوٹ لیتا ہے ہمیں دکھائی نہیں دیتا۔ راستے میں کوئی سانپ بیٹھا ہوتا ہے نظر نہیں آتا۔ ہمیں ڈر لگتا ہے خواہ مخواہ رات کی تاریکیوں سے تنہائیوں سے ڈر آتا ہے۔ دن میں ایک جگہ سے ہم آرام سے گزر جاتے ہیں۔ اسی جگہ سے رات ڈرتے ہیں۔ نہیں گزرتے حالانکہ جگہ وہی ہے صرف رات کی تاریکی ہم پر ہیبت طاری کر دیتی ہے۔ تو فرمایا تمہاری نسبت سے ہے۔ جب اس کی نسبت آپ اللہ سے کریں گے تو رات بھی اس کی اپنی تخلیق ہے۔ اس نے اپنی پسند سے بنائی ہے اور اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ آپ یہ نہ سوچیں کہ اللہ کیلئے رات مشکلیں پیدا کرتی ہوگی۔ انسان جب سوچنے بیٹھتا ہے تو اللہ کی عظمت کو اس کی شان کے مطابق سوچے۔ اپنے اوپر قیاس کرنا شروع کر دیتے۔

اسی لیے رات کو یہاں مقدم رکھا۔ وہ ایسا قادر ہے کہ رات بھی اس کی ویسی ہی مخلوق ہے۔ جیسے دن اس کی تخلیق ہے۔ دن میں ایک کمزور سا آدمی بھی دلیر ہو جاتا ہے۔ وہ نہیں ڈرتا ایک بچہ بھی نہیں ڈرتا۔ ہم اپنی چیزوں کی نگہبانی کر سکتے ہیں۔ سارا دن کام بھی کرتے رہتے ہیں، سارا دن جاگتے رہتے ہیں۔ ہمیں بہت سی آسانیاں آجاتی ہیں۔ بہت سی جرأت آجاتی ہے۔ بہت سی سہولتیں نظر آتی ہیں۔

فرمایا: یہ جو رات کی مشکلات تمہیں نظر آتی ہیں یہ تمہاری نسبت ہیں کہ تم مخلوق ہو لیکن وہ خالق ہے اور دن بھی اس کی مخلوق ہے۔ رات بھی اس کی مخلوق ہے۔ دن میں جو آسانیاں ہیں یہ بھی اس کی پیدا کردہ ہیں اور رات میں جو مشکلیں تمہیں نظر آتی ہیں وہ بھی اس کی تخلیق ہے۔ اس کے لیے مشکلیں نہیں ہیں۔ اس کی اپنی صنعت ہے۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ اس لیے

اس کی ذات کو اپنے پر قیاس نہ کیا کرو۔

یہ سورج یہ چاند ستارے یہ آسمان یہ جو سمادی یہ کائنات کی وسعتیں یہ سب کچھ تو اس کی اپنی صنعت ہے اس کا اپنا بنایا ہوا ہے اور یہ سارا عالم اس کے اپنے قبضۂ قدرت میں ہے۔ سب کچھ اس کے سامنے موجود ہے سب پر اس کا حکم ہر آن جاری و ساری ہے۔

فرمایا! ان کی حیثیت تو یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں زیر آسمان سرکل میں ہیں ان میں مجال کم و زون نہیں یعنی اس نے بنا کر انہیں جس روش پر لگا دیا ہے ذرا سورج سے کہو کہ وہ راستہ بدل کر دیکھے ذرا چاند سے کہو جو ڈیوٹی اس کے ذمہ لگی ہے اس کو وہ چھوڑ دے انہیں ایک لحہ فرصت بھی نہیں کہ اپنا راستہ بدل کر اوپر جائیں یا نیچے آئیں۔ جہاں اللہ نے انہیں چلا دیا ہے۔ اس راستے سے یہ دائیں بائیں سرکنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

اب رہی یہ بات کہ دنیا بجائے خود یہاں ہمیشہ رہنے کی نہیں اور آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی بھی انسان اگر تک گیا ہو۔

آپ سے پہلے انسانیت کا کوئی بھی فرد یہاں ہمیشہ نہیں رہا۔ مشرکین مکہ کہتے تھے کہ ہر تغلبی کا کوئی وقت ہوتا ہے اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آج ہماری بات نہیں مانتے تو آدھی عمر تو ان کی گزر چکی ہے۔ زیادہ جی لیں گے، بیس، پچیس تیس سال اور، اس کے بعد اس دنیا سے چلے جائیں گے۔ ان کی بات ختم ہو جائے گی۔ ہم ان کو مسند سر کیوں بنائیں۔ انہیں پتہ ہے لوگ مر جاتے ہیں ان کی بات ختم ہو جاتی ہے۔

اللہ نے فرمایا! اگر آپ دنیا سے چلے جائیں گے۔ یہ لوگ زعم باطل میں آپ کی موت کے منتظر ہیں ان کے پاس کوئی دلیل ہے کہ یہ خود یہاں رہ جائیں گے۔ یہ بھی تو چلے جائیں گے کیونکہ یہاں کوئی نہیں رہا۔ پھر انہیں کیا فائدہ ہوگا۔ یہ آپ کی موت کا سماذ اللہ انتظار کر رہے ہیں کہ آپ معاذ اللہ دنیا سے چلے جائیں گے تو دنیا سے جانا نہیں ہے انہیں دنیا فارغ مل جائے گی یہ تو بڑی جاہلانہ سی بات ہے۔ انہیں بھی تو جانا ہے۔

اس ضمن میں اللہ نے ارشاد فرمایا۔ یہ چلے جانا ہے کیا؟ کیا موت ہر چیز کو فنا کر دیتی ہے۔ تمام کہانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ باتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ بڑے بڑے ہنگامے ہو جاتے ہیں۔ فرمایا۔

ہر متنفس نے موت کو چکھنا ہے۔ اس لیے کہ دنیا رہنے کے لئے نہیں بنی یہ امتحان گاہ ہے۔ یہ ایک آزمائش کی جگہ ہے جہاں خیر بھی ہے شر بھی۔ نیکی بھی ہے برائی بھی۔ انسان کو دونوں کی اہلیت بھی بتا دی گئی ہے دونوں راستے بھی بتا دیے گئے ہیں۔ شعور و آگہی بھی دے دی گئی ہے۔ توفیق عمل بھی دیدی گئی ہے اور اس میں چھوڑ دیا گیا ہے کہ اب اپنے لیے کوئی راستہ منتخب کر لو اور اسکا نتیجہ اس دنیا میں نہیں نکلتا بلکہ یہ موت ہی وہ راستہ ہے جس راستے سے وہ اپنے اس نتیجے کو پہنچتا ہے۔ جو اس امتحان گاہ یا اس آزمائش گاہ یا اس دنیاوی زندگی کا ہے۔

جب کسی کو آزمائش میں ڈالا جاتا ہے تو صرف آزمائش کوئی مقصد نہیں ہر آزمائش کا کوئی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس نتیجے پر کچھ نہ کچھ اثرات مرتب ہوتے ہیں اچھے یا برے۔ ورنہ آزمائش کا تو کوئی مقصد ہی نہ رہا۔

فرمایا یہ دنیا رہنے کی نہیں یہ تو کمرہ امتحان ہے۔ یہ آزمائش گاہ ہے۔ یہ امتحان گاہ ہے آپ کمرہ امتحان میں ہمیشہ نہیں رہتے۔ ہم جو امتحان دینے کے لیے جاتے ہیں۔ اپنا پرچہ حل کر کے چلے جاتے ہیں۔ پرچے میں کیا لکھا یہ ممتحن جانے وہ نمبر لگاتا ہے وہ اسے بتاتا ہے کہ تم کامیاب ہو۔ اس طرف چلے جاؤ تم ناکام ہو تمہاری یہ جگہ ہے۔ فرمایا یہ جو موت ہے یہ فنا نہیں ہے مر کر تم ختم نہیں ہو جاتے ہو بلکہ موت تمہیں لوٹا کر میرے پاس لے آتی ہے موت کسی فنا کا نام نہیں ہے کہ موت لگل لیتی ہے آدمی کو یا آدمی ختم ہو جاتا ہے یا صفحہ ہستی سے بالکل نابود ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں بلکہ موت یہ تمہارا امتحانی عرصہ ہو تھا میری بارگاہ میں آنا ہے جس کا راستہ یا دروازہ یا یہاں آنیکا ذریعہ یا سبب کہہ لو اس حالت کا نام موت ہے۔

حدیث شریف میں بڑی وضاحت سے ہے اس بات کی اصل انسانی زندگی جو ہے وہ عرصہ محشر سے شروع ہوتی ہے کیونکہ اس دنیا میں آنے سے پہلے ارواح موجود ہیں۔ عالم ارواح میں۔ لیکن وجود کے ذرات جو ہیں وہ روئے زمین پر منتشر ہیں۔ کوئی ذرہ کہیں ہے کوئی کہیں ہے۔ لیکن اللہ کا نظام اتنا منظم ہے کہ ہر وجود کا ذرہ اس کے علم میں موجود ہے کہ کون سا ذرہ کس

وجود کا حصہ بنے گا۔ وہی شخص پیدا ہوتا ہے جس کی غذا بن کر، وہ ایک کراس کے وجود کا حصہ بنتی ہے دوسرے کے وجود پر نہیں جا کر لگتی۔ اسی لیے ارشاد فرمایا۔

کوئی نفس تب تک موت سے ہمکنار نہیں ہوتا جب تک اپنے حصے کا رزق پورا نہ کر لے۔ کوئی آدمی ایک لقمہ چھوڑ کر نہیں مرتا کوئی آدمی ایک لقمہ زائد نہیں کھا سکتا۔ کیونکہ یہ ساری غذا مٹی ہی ہے۔ مادہ ہی ہے اور وہی کچھ مادہ ہر شخص لیگا جو اس کے وجود کا حصہ ہے۔ دوسرے کے وجود کا نہیں لے گا۔ ہم دوسرے کی گندم چھین سکتے ہیں۔ لیکن ہم کھا وہی سکتے ہیں جو ہمارے وجود کا حصہ ہے۔ باقی دوسروں کیلئے رہ جائے گا۔

دوسرا سٹیج یہ راستہ ہے جب بدن اپنی صورت اختیار کرتا ہے۔ اجزاء جمع ہوتے ہیں ایک شکل متشکل ہوتا ہے۔ روح ڈالی جاتی ہے اس صورت میں مکلف بذات بدن ہوتا ہے یا سامنے بدن ہوتا ہے بات بدن سے کی جاتی ہے۔ اعمال بدن سے ہوتے ہیں روح اس کے تابع ہوتی ہے۔ ہم سب کو پتہ ہے کہ ہم میں روح موجود ہے لیکن اگر کوئی کہہ دے کہ میں نے روحانی طور پر نماز پڑھ لی۔ تو اس کی نماز ادا نہیں ہو گی۔ کوئی کہہ دے کہ میں نے روحانی طور پر میں نے کھانا کھا لیا۔ تو وہ زندہ نہیں رہ سکے گا مکلف بذات بدن ہے۔ سردی گرمی بدن کو لگے گی۔ بیماری بدن کو لگے گی۔ صحت مند ہونا بنیادی طور پر بدن کا ضروری ہے۔ اور یہ ساری چیزیں روح کو متاثر کریں گی۔ اگرچہ ہمیں نہ روح نظر آ رہی ہے نہ ہمارے پاس اس کا کوئی پیمانہ ہے لیکن ہم کہہ اٹھیں گے کہ اس بیماری نے تو میری روح کو بھی پریشان کر دیا۔

اس کے بعد وہ زندگی ہے جب آدمی موت سے گزرتا ہے تو صورت حال بدل جاتی ہے۔ بدن تابع ہو جاتا ہے مکلف بذات روح ہو جاتا ہے برزخ کی زندگی میں جس طرح یہاں بدن سامنے ہے اور روح پیچھے ہے اس کا یہ حالت بدل جاتی ہے۔ روح سامنے آ جاتی ہے۔ اور بدن اس کے پیچھے چلا جاتا ہے یعنی بدن کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے روح کی وساطت سے ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ حالت روحانی ہے۔ وہاں کے موسم روحانی ہیں۔ وہاں کی غذائیں روحانی ہیں۔ فضائیں روحانی ہیں وہ عالم ایسا ہے تو وہاں جو کچھ ہوتا ہے براہ راست روح کے ساتھ ہوتا ہے اور

روح کا رابطہ اس جزو بدن سے ہے۔ جو کبھی اس کے بدن کا حصہ رہا حدیث شریف میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ جو ناخن ہم استعمال کرتے ہیں، جو بال ہم کٹوا کر پھینک دیتے ہیں۔ جتنا عرصہ جو بال جو ناخن جسم پر رہا۔ اس وقت ہم نے نیکی کی اور اس کا ہمیں ثواب مل رہا ہے۔ تو اس حصہ بدن کو بھی اس کا ثواب پہنچے گا۔ اگر اس کے ہوتے ہوئے ہم نے گناہ کیا اور اس کی سزا مل رہی ہے تو اس کا حصہ بھی اسے وہاں پہنچے گا۔

زندگی میں انسان کا جسم مسلسل بدلتا رہتا ہے خلیے بنتے رہتے ہیں۔ غالباً انہوں نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی۔ حدیث شریف میں ملتا ہے کہ جتنا بھی کوئی عنصر انسانی وجود کا حصہ رہا ہے ان سب کو واپس جمع کر دیا جائے گا اور حضورؐ فرماتے ہیں کہ جہنم میں آپ دیکھیں گے کہ کافر کے وجود کو اس کی ایک ایک داڑھ جو ہے وہ احد پہاڑ کے برابر ہو جائے گی۔ ایک آدمی سو سال ستر سال اسی سال زندہ رہا۔ اس کے وجود پہ غذا نے کتنے خلیے بنائے کتنے مٹتے گئے۔ ان سب کو جب واپس کیا جائے گا۔ وہ بہت بڑا بنے گا جسم کو۔ یہی تو کمال قدرت ہے کہ وجود کے جس خلیے نے جتنا گناہ کیا ہے بیک وقت ایک وجود میں رہتے ہوئے اسے اتنا عذاب ہو گا زائد نہیں یا جس حصہ بدن نے جتنی نیکی کی ہے۔ اس کو اتنا ثواب ہو گا۔ زائد نہیں اگر زائد دے تو اس کی مہربانی مستحق وہ اتنے کا ہو گا۔ اور نیکیاں یا انعامات میں زیادتی کی جائے گی۔ عذاب میں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی جائے گی۔ یہی تو اس کی قدرت کا کمال ہے۔

اب یہاں اگر ہم اس کو اپنے اوپر قیاس کرنے لگیں یہاں قدرت باری کو ہم اپنی طرح کھڑا کر دیں کہ ہم جب انجکشن لگاتے ہیں تو ہم یہ نہیں کر سکتے کہ آدھے جسم کو اس کی طاقت پہنچے اور آدھے کو نہ پہنچے بلکہ اب تو سائنس کے پاس بھی ایسے انجکشن آ گئے ہیں دوائیں آ گئی ہیں جو ایک قسم کے اجزائے جسم کو متاثر کرتی ہیں۔ دوسرے کو نہیں کرتیں آج تو میڈیکل سائنس میں ایسی چیزیں ہیں ایسے انجکشن ہیں ایسی گولیاں ہیں جو ایک جسم کے اجزاء کو تقویت دیتی ہیں ان کو گھٹاتی بڑھاتی ہیں۔ دوسرے جسم کے اجزاء کو متاثر ہی نہیں کرتیں۔

تو قدرت باری کیلئے یہ کیا مشکل ہے۔

دراصل جب قیامت قائم ہوگی تو بدن اور روح دونوں برابر برابر مکلف ہو جائیں گے ۔ جتنی بدن میں استعداد ہوگی اتنی ہی روح میں بھی استعداد ہوگی جس طرح اب بدن دیکھتا ہے ہمیں نظر آتا ہے ۔ میدان حشر میں روح بھی اسی طرح دیکھے گی ۔ روح نظر بھی آئے گا ۔ یعنی اس سے پہلے زندگی آدھی آدھی رہی عالم ارواح میں روح ہے بدن ہے ہی نہیں ۔ دنیا میں بدن مکلف تھا روح اس کے تابع ہو گیا ۔ برزخ میں گئے تو روح مکلف بذات ہے بدن اس کے تابع ہوگیا ۔ سمجھتے ہیں کہ مٹی کھا گئی گل گیا ۔ اس کے اجزا ر کہیں بھی چلے جائیں روح کے ساتھ ہر ذرّے کا تعلق رہتا ہے بلاواسطہ ثواب ہو یا عذاب ہو ۔ روح کو ہوتا ہے اور روح کی وساطت سے ہر ذرّے تک پہنچتا ہے جو اس بدن کا حصہ کبھی رہا ہو ۔ اور وہ جہاں بھی ہو وہاں ہوتا ہے ۔

اب زندگی کا جو اس سے اگلا دور ہے وہ ہے میدان حشر ۔ حشر جب قائم ہوگا تو اس وقت روح اور بدن دونوں میں برابر حیات آجائے گی ۔ یعنی جو جسمانی لذتیں ہیں یا جسمانی تکلیفیں وہ بھی ہم محسوس کریں گے جو روحانی لذتیں یا روحانی تکلیفیں ہیں وہ بھی محسوس کریں گے ۔ اور سارے انسان کریں گے خواہ وہ مومن ہے یا کافر ۔ کافر جہنم میں کھڑے ہو کر دیکھ رہے ہوں گے کہ دیکھو وہ جنتی کتنی موج کر رہے ہیں ۔ پھل کھا رہے ہیں ۔ پانی پی رہے ہیں یہاں بہت ہیں ۔ وہ فلاں تو ہمارا دوست تھا ۔ فلاں تو ہمارا پڑوسی تھا فلاں تو ہمارے ساتھ رہتا تھا ۔ پھر انہیں کہیں گے ۔ کچھ ہمیں بھی تو چکھاؤ ، اور نہیں تو ہماری طرف کچھ پانی ہی پھینک دو ۔ دوزخ کہاں ہے ۔ جنت کہاں ہے ۔ کتنے فاصلے ہیں لیکن یہ استعداد انہیں بھی ہوگی ۔ ان کی آواز وہ جنت میں سن لیں گے ۔ کافر دوزخ سے جنت کو دیکھ رہا ہوگا ۔ تو یہ دیکھنا دل کی آنکھ سے ہوگا ۔ کافر کی روح میں بھی وہ استعداد ہوگی جو روحانی ہوتی ہے اور بدن میں بھی ہوگی ۔ وہاں سے وہ جواب دیں گے ۔

بھئی ہمارے باپ کی نہیں ہے یہ تو اللہ کی ہے اور اللہ نے کافروں پر اسے منع کردیا ہے ۔

وہ وہاں سے بات کریں گے جنتی دیکھ رہا ہوگا جنتیوں پر اللہ کی رحمت ہوگی ۔ دوزخی بھی دیکھ رہا ہوگا ۔ اس کا مطلب ہے من حیث الانسان یعنی ہر انسان کی روح ، ہر انسان کا بدن مکلف ہو جاتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کا جو اپنا کمال ہے جو جو بن ہے میدان قیامت سے وہ صحیح زندگی ہوگی ، وہ زندگی کا کمال ہے ۔ اللہ کریم فرماتے ہیں پھر کبھی ختم نہیں ہوگی ۔

اور موت کتنا عرصہ رہے گی ؟ حدیث شریف میں موجود ہے جب قیامت قائم ہوگی تو جنت بھی سجا کر لائی جائے گی ۔ میدان قیامت میں ۔ دور نہیں ۔ چھوڑ نہیں جائے گی بلکہ سجا کر قریب کر دی جائے گی ۔ دوزخ کو بھی کھینچ کر قریب لایا جائے گا ۔ تو جنت بھی دیکھ لیں گے دوزخ بھی دیکھ لیں گے ۔ سامنے آجائے گا ۔ اور جب جنتی جنت میں دوزخی دوزخ میں داخل کر دیئے جائیں گے ۔ تو ایک فرشتہ ایک بڑا سا دنبہ لے کر ان کے درمیان کھڑا ہوگا ۔ ان دونوں کو پکار کر متوجہ کرے گا ۔ جنتیوں کو بھی اور دوزخیوں کو بھی اور انہیں کہے گا دیکھو یہ میرے پاس کیا ہے ۔ یہ موت ہے اور آج سے اللہ نے اسے ختم کر دینے کا حکم دیا ہے ۔ آج کے بعد تم دونوں کے لیے موت نہیں ہے ۔ اب تمہیں ہمیشہ زندہ رہنا ہے یعنی انہیں دکھا کر انہیں بتا کر اسے ذبح کر دیا جائے گا ۔ دنبے کی شکل میں موت ہوگی اور یہ موت کا آخری لمحہ ہوگا ۔ اور وہ جنتیوں کو بتا دیگا کہ بے فکر ہو کر آرام کرو کھاؤ پیو اور اس بات سے بے فکر ہو جاؤ کہ تم کبھی مر جاؤ گے یا تمہیں موت آجائے گی ۔ اور دوزخیوں کو کہے گا کہ جو کچھ تمہیں بھگتنا ہے ۔ اس بات سے ناامید ہو کر بھگتو کہ کبھی مر بھی جاؤ گے ۔ جلتے رہو گے ۔ لیکن موت نہیں آئے گی ۔ تو جب انسانی زندگی مکمل ہوگی تو موت اپنی عمر طبعی پوری کر چکی ہوگی ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کے مقابلے میں موت کوئی چیز نہیں ہے ۔ یعنی انسانی زندگی کو موت کیسے نگل سکتی ہے ۔ انسانی زندگی بہت بڑی ہے ۔ اور موت اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی ۔ جب انسانی زندگی شروع ہوگی تب موت ختم ہو چکی ہوگی ۔ انسانی زندگی اس وقت مکمل شکل اختیار کرے گی ۔

اس دنیا میں اسی لیے نور ایمان اور نور نبوت تقسیم فرمایا اللہ کریم نے کہ جو سعادت مند اور راغ ہوتی ہیں ان کے لیے جنت کی زندگی یہاں عطا فرما دی ۔ یا وہ آخرت کی زندگی یا وہ مکمل سالم زندگی جو عرصہ محشر میں نصیب ہوگی نور نبوت سے وہ یہاں نصیب

ہو جاتی ہے۔ انبیاء کی زندگی اس کا نمونہ ہوتی ہے کہ وہ تجلیات باری کو پاتے ہیں۔ فرشتوں سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ جنت و دوزخ کو دیکھتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کو بھی دیکھتے ہیں۔ دنیاوی رنج و الم بھی پاتے ہیں۔ گرمی سردی بھی محسوس کرتے ہیں۔ یعنی دونوں چیزیں وہ روحانی لحاظ سے بھی زندہ ہوتے ہیں۔ ان کی روح بھی بے قید نہیں ہوتی۔ روحانی زندگی بھی ہوتی ہے۔ جسمانی زندگی بھی ہوتی ہے اور یہی کمال ان کا حصہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا ایک جسم سے ملتی ہے اور مومن جسمانی اور روحانی حیات کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔

مسلمان اور غیر مسلم میں بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ جس نعمت کا غیر مسلم کو وہاں جا کر پتہ لگے گا۔ وہ مومن کو یہاں نصیب ہو جاتی ہے۔ بطفیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ہر دور میں ہر نبی نے یہی نعمت تقسیم فرمائی ہے۔ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ وہ حقائق وہ انعامات اخرویہ وہ نور ایمان وہ حیات قلبی وہ حیات روحانی جو وہاں جا کر اوروں کو نصیب ہوگی۔ یہاں مل جاتی ہے۔ یہاں نور ایمان سے یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ برائی کی صحیح صورت یا کردہ صورت جو ہے وہ سامنے آجاتی ہے۔ بھلائی کا حسن سامنے آجاتے ہیں۔ برائی سے بچنے کو جی چاہتا ہے۔ نیکی کی طرف بڑھنے کی توفیق ارزاں ہو جاتی ہے۔ اور آدمی کے سامنے ایک واضح اور صحیح صورت حال ہوتی ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ وہاں جا کر یہ افسوس کرے کہ میں نے یہ کیا کر لیا۔ یہاں دیکھ کر تو کھڑا ہوا لیکن ہو سکتا ہے وہ سارے بچھو ہوں اسے یہاں نظر آجاتا ہے کہ یہ سارے بچھو ہیں یا کیڑے ہیں۔ یہ زہر ہے یا کھانے کی چیز ہے یا استعمال کی ہے یہ زہر ہے یا میٹھی چیز ہے۔ اس کو نور ایمان۔ نور نبوت اور اسی کو اسلام کہتے ہیں یہ بہت بڑا امتیاز ہے دین برحق کا۔

اسی لحاظ پر اسی کی تردید کرنے کو فضیلت علمی کہا جاتا ہے محرومی کی انتہا ہے کہ کوئی انسان صحت کو بیماری کہہ دے۔ اب یہ ہے کہ محرومی کی انتہا ورنہ ہر انسان کو نصیب ہوگی وہ مومن کو یا تابع نبوت یہاں نصیب ہوتی ہے۔

جیسے ایک صحابی حاضر ہوئے مسجد نبوی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔

" آپ نے کیسے صبح کی "۔" یا رسول اللہ ایمان کے ساتھ آپ نے فرمایا تمہارے ایمان کی کیا دلیل ہے۔ تو وہ دروازے کے اندر کھڑے تھے۔ وہیں رک گئے۔

آپ نے فرمایا۔ تم نے سچ کہا یعنی تمہارے مومن ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔ ایمان کی دلیل ہی یہ ہے کہ حقائق اخرویہ جو ہیں وہ حقائق کے درجے میں نہ رہیں۔ بلکہ وہ حقیقت بن جائیں اور یہ استعداد پیدا ہو جائے کہ اگر مشاہدہ نہ ہو تو کم از کم استحضار کی کیفیت تو ہو۔ اس طرح یقین ہو کیونکہ وہاں تو مشاہدہ جو ہوگا وہ کافر کو بھی ہوگا۔

موت کوئی ایسی بلا نہیں ہے جو انسان کو نگل لیتی ہے۔ بلکہ یہ ایک تبدیلی ہے۔ یہاں بدن مکلف بالذات ہے موت آتی ہے تو بدن کو سلا دیتی ہے۔ اور روح مکلف بالذات ہو جاتا ہے۔ لیکن موت اس کا تعلق دنیا سے یکسر ختم نہیں کر دیتی۔ اس کا تعلق دنیا سے قائم رہتا ہے برزخ کا ایک سرا دنیا سے ملا ہوا ہے۔ اور ایک سرا آخرت سے۔ برزخ درمیان میں ہے ایک آدمی کوئی ایک کام کر کے چلا گیا جب تک وہ نیکی باقی ہے موت اس نیک عمل کے درمیان دیوار پیدا نہیں کر دیتی۔ جب تک وہ نیکی چلتی رہے گی اس کا ثواب اس کو وہاں پہنچتا رہیگا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اس دنیا میں اپنی نیکی کے ساتھ موجود ہے۔ اسی طرح آپ والدین کی طرف سے یا بزرگوں کی طرف سے حج کرتے ہیں، قربانی دیتے ہیں۔ صدقہ دیتے ہیں۔ ایصال ثواب کرتے ہیں اس کا فلسفہ یہ ہے کہ اس نیکی کا اجر اللہ کریم تمہیں، روح منقطع ہو چکا ہوتا تو وہاں کیسے پہنچتا۔

جو تصوف ہم نے ہندوازم سے لیا ہے کہ ہم برزخ میں بیٹھے ہوئے بزرگوں کو یا دنیا سے چلے جانے والے لوگوں کو پکڑ کر ان سے دنیا کے کام نکلوانا چاہتے ہیں۔ یہ فلسفہ بنیادی طور پر ہی غلط ہے۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ جو لوگ برزخ میں ہیں۔ یا قبروں میں آرام کر رہے ہیں۔ وہ وہاں سے آئیں یہاں ہماری کھیتیوں میں ہل جوتیں، یہاں ہمارے مقدمے لڑیں۔ یہ منطق ہی الٹی ہے۔ ایک شخص دنیا کے جھمیلوں سے فارغ ہو گیا وہ اس زندگی کا مکلف ہی نہیں ہے تو اس کو کیا ضرورت ہے کہ جس زندگی کا وہ مکلف ہی نہیں ہے اس میں وہ کیوں مداخلت کرے۔ یعنی آپ اس انداز سے سوچئے کیا وہ ثواب عذاب کا مکلف نہیں ہے۔ تو برزخ سے یہاں آکر کسی کام میں مداخلت

کرے گا تو اسے اللہ کے سامنے جواب نہیں دینا؟ وہ کیوں کرے۔

اس وقت کی بات ہے جب ہم چار پانچ ساتھی ہوا کرتے تھے اللہ انہیں غریق رحمت کرے فوت ہو چکے۔ ان کے بڑے اچھے مشاہدات تھے۔ انہیں کام تھا ہائی کورٹ میں۔ وہ وہاں گئے ہائیکورٹ سے ہو کر وہ داتا صاحب کے مزار پہ چلے گئے سلام کرنے کے لیے۔ دعا کرنے کے لیے۔ وہاں سے جب واپس آئے تو میں وہاں موجود تھا۔ حضرت جی کے پاس ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مشاہدہ سنایا بڑے مزے کی بات۔ حضرت میں داتا جی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پہ حاضر ہوا۔ میں نے مراقبہ کیا بڑی شفقت فرمائی انہوں نے میرے ساتھ، لیکن میں نے دیکھا کہ کوئی کوئی سجدے کر رہا ہے کوئی دیوار کے ساتھ کھڑا ہے کوئی کچھ کر رہا ہے کوئی کچھ کر رہا ہے تو مجھے دکھ ہوا۔ میں نے ان سے عرض کی حضرت آپ مزے سے بیٹھے ہیں اندر اور یہ ساری آپ کی پوجا کر رہے ہیں آپ ان کو منع کیوں نہیں کرتے وہ تو ویسے زمینداری کرتا تھا، کاشتکاری کرتا تھا مولوی نہیں تھا۔ پرانے زمانے کا نمبردار تھا۔ تو کہنے لگا انہوں نے مجھ سے فرمایا۔ جب تک میں دنیا میں تھا میں مکلف تھا اور میں نے بڑا کام کیا۔ اب اس کا جواب تم لوگوں سے لیا جائے گا۔ مجھے مشورے نہ دو ہو سکتا ہے تو انہیں منع کرو اور یہ کتنا علمی جواب ہے، کتنی عالمانہ بات اور کھری بات کہی۔ کہ جب تک میں دنیا میں تھا میں لوگوں کو سمجھانے کا مکلف تھا۔ میں نے لوگوں کو سمجھایا یہی کام کیا، جب میں برزخ میں چلا آیا تو میں دنیا میں تبلیغ کرنے کا مکلف نہیں ہوں۔ ان کے سجدوں کے بارے میں خدا تم لوگوں سے پوچھے گا۔ جو دنیا میں موجود ہیں، پوچھے گا یہ تمہاری ذمہ داری ہے انہیں سمجھاؤ میں برزخ سے نکل کر وعظ کرنے کا مکلف نہیں ہوں۔

برزخ کی زندگی سے یہ مراد نہیں ہے جو جہلاء لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک بزرگ ہوا کرتے تھے۔ فوت ہو گئے ہیں۔ رشتہ دار تھے وہ ہمارے۔ ان کی گدھی گم ہو گئی۔ پھرتے رہے دھکے کھاتے رہے۔ کہنے لگے کہ ہم کیا ڈھونڈیں گے ہمارے پیر صاحب تلاش کر کے چھوڑ جائیں گے۔ بھلا پیر صاحب کو کیا مصیبت ہے کہ برزخ سے آدھی رات کو آئیں اور گدھی تلاش کر کے چھوڑ جائیں۔ کسی کو برزخ سے اٹھ کر گدھیاں تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے دنیا کے باقی امور میں یا مقدمے لڑنے کی کیا ضرورت ہے یہ تو

آپ کیلئے

۱۔ المرشد نہ ملنے کی شکایت ماہ کے آخر میں اس پتے پر بھیجئے۔
صوبیدار عبدالغفور عابد دارالعرفان، سب آفس نور پور۔ ضلع چکوال۔

۲۔ تبصرے، تجاویز، مشورے، مضامین برائے اشاعت اور دیگر معلومات کیلئے یہ پتہ استعمال کریں۔
مدیر ماہنامہ "المرشد"۔ A/2-41 گلبرگ ۳۔ لاہور۔

ایسے لوگ ہوتے ہیں جو زندگی میں ان جھمیلوں میں نہیں پڑتے۔ برزخ سے آ کر یہ عدالت میں جا کر کب پیشیاں بھگتیں گے۔ یہ جو کچھ ہم کرتے ہیں یہ ہم نے ہندو مازم سے لے کر اس میں داخل کیا ہے۔

دینی امور میں رہنمائی حاصل کرنا، برکات حاصل کرنا، اذکار کرنا۔ انوارات کا حاصل کرنا۔ قوت روحانی کا حاصل کرنا۔ اسی کو اصل میں فیض کہا جاتا ہے۔ تصوف میں فیض سے مراد یہ ہے کہ آپ وہ قلبی برکات، روحانی قوت وابستہ اور وہ کیفیات حاصل کریں جو اس روحانی زندگی کے لیے ضروری ہیں کیونکہ یہ تو انہیں برزخ میں بھی ترقی بخشتی ہیں۔ وہاں بھی ان کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے برکات میں اضافہ نہ ہو تو قوت میں تو اضافہ ہوتا ہے۔ کیونکہ برزخ میں درجات میں اضافہ ممکن نہیں۔ برکات وہی رہتی ہیں۔ جو وہ دنیا سے لے کر گیا۔ یا پھر درجات میں اضافہ کرنے کے لیے جو دنیا میں موجود ہے۔ وہ اگر کوئی نیکی کرے بخشے یا وہ کوئی نیکی دنیا میں چھوڑ گیا وہ پھیل رہی ہو تو دنیا میں جو عمل ہوتا ہے اس کے طفیل تو درجات

میں ترقی ہوتی ہے جو عمل کوئی برزخ میں کرتا ہے اس کے طفیل درجات میں ترقی نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ برزخ میں عمل کا مکلف ہی نہیں رہتا کوئی شخص تالاب بنا گیا۔ کنواں بنا گیا۔ اس کا عقیدہ درست تھا۔ مومن تھا۔ دیندار تھا عقیدہ صحیح تھا گنہگار بھی تھا۔ ممکن ہے اس نے کوئی ایسا ادارہ بنا دیا جہاں دین سکھایا جاتا ہے۔ جہاں غریب پرورش ہوتی ہے۔ جہاں کوئی اور نیکی کا کام ہوتا ہے۔ تو کبھی اس کی نجات ہو جائے اسے اور برکات نصیب ہو جائیں یا نیک تھا اسے مزید ثواب پہنچتا رہے۔ تو جو عمل دنیا میں ہوتا ہے اس کے طفیل درجات بھی بڑھ سکتے ہیں۔ آپ ایصال ثواب کرتے ہیں۔ آپ حج کر کے بخش دیتے ہیں۔ اور اس طرح کے کام کرتے ہیں تو اس سے ترقی درجات ہو سکتی ہے۔ لیکن از خود برزخ میں رہ کر ان شاء اللہ کر کے یا جو توجہ حضرات دیتے ہیں اس سے ان کی قوت بڑھتی ہے۔ درجات نہیں بڑھتے۔ کیونکہ برزخ میں وہ مکلف نہیں ہوتے۔

یہ موت کی حقیقت ہے کہ موت بالکل اسی طرح کا ایک انقلاب ہے جس طرح عالم ارواح سے شکم مادر میں آتا ہے تو کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا، کچھ نہیں بگڑتا۔ روح کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ عالم امر میں ہوتی ہے جب شکم مادر میں بچہ ہوتا ہے تو اس میں روح آجاتی ہے پھر ماں کے پیٹ سے دنیا میں پیدا ہو جاتا ہے: تو کوئی فرق نہیں پڑتا روح ویسی ہی رہتی ہے۔ اس بدن کے ساتھ دنیا میں آجاتی ہے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح دنیا سے جب برزخ میں جاتی ہیں تو اس سفر کو وہ شکم مادر سے دنیا میں آنے والے سفر میں بھی اس نے ایک جگہ خالی کر دی اور ایک جگہ پہ ہو گئی۔ زندگی کا ایک رخ ختم ہوا دوسرا شروع ہوا اسے پیدائش کہتے ہیں اور جب یہ رخ ختم ہوتا ہے تو اگلا رخ شروع ہوتا ہے۔ اسے ہم موت کہہ دیتے ہیں وہ بھی اسی طرح کا سفر ہے کہ دنیا سے نکل کر وہ برزخ میں چلی گئی۔ ہاں فرق یہ پڑتا ہے کہ یہاں مکلف بالذات بدن ہے وہاں مکلف بذات روح ہو جاتا ہے اور فرمایا یہ راستہ ہے جو میری بارگاہ کی طرف آتا ہے۔

یہ زندگی کا خاتمہ نہیں ہے۔ یہاں بس نہیں ہو جاتی بلکہ تم سب کو میری ہی طرف آنا ہے اور جو شرتا ہے وہ اس راستے پہ گامزن ہو جاتا ہے۔ عرصہ محشر میں یہ ہوگا کہ ایک انقلاب اور آئے گا۔ روح اور بدن برابر مکلف ہو جائیں گے۔ اس کے بعد اور کوئی انقلاب نہیں آئیگا انسانی زندگی مکمل ہو کر اپنے کمال کو پہنچ جائے گی۔ روح اور بدن دونوں کے لیے دونوں طرح کی لذات ہوں گی۔ روحانی بھی ہوں گی مادی بھی ہوں گی۔ کھانے کو بھی ہوگا۔ لباس بھی ہوگا۔ اور تجلیات باری بھی ہوں گی جنت میں۔

اسی طرح دوزخ میں عذاب الہٰی کی کیفیات روحانی بھی ہوں گی اور مادی بھی ہوں گی۔ آگ بھی ہوگی اور مار پیٹ بھی ہوگی۔ اور روحانی کوفت جو عذاب الہٰی کی اللہ سے کلام نہ ہوتا، دعاؤں کا نہ سنا جانا، ہمیشہ کے لیے راندہ درگاہ اور جو روحانی استعداد و کیفیات ہیں۔ وہ بھی ہوں گی جو مادی اور جسمانی ہیں وہ بھی ہوں گی۔ کیونکہ روح بھی محسوس کرے گی بدن بھی محسوس کرے گا۔

تو یہ موت کوئی انوکھی یا ایسی عجیب شے نہیں ہے۔ اصل اس میں الجھاؤ پیدا ہو رہا ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم اس کو اپنے عقل سے اپنی ذات کے اوپر قیاس کر کے حل کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں بہت مشکل نظر آتی ہے۔ لیکن اگر اسے قدرت باری کے سامنے رکھا جائے تو اللہ کے لیے جیسے عالم ارواح میں کوئی روح ہے وہ اللہ کے سامنے موجود ہے۔ شکم مادر میں کوئی روح موجود ہے۔ جسطرح ماں اللہ کے سامنے موجود ہے۔ اس طرح شکم مادر میں جنین اللہ کے سامنے موجود ہے۔ جسطرح زمین پہ چلنے والا انسان اس کے سامنے موجود ہے۔ اس طرح زمین کے نیچے دفن ہونے والا برزخ میں رہنے والا بھی اس کے سامنے موجود ہے۔ اسی طرح عرصہ محشر میں بھی سارے اس کی ذات کے لیے یا ان امور کے لیے جو وہ انسان کے ساتھ انجام دینا چاہتا ہے اس کی رضا کے ہوں یا اس کی نارضامندی کے۔ ان میں نہ موت آڑے آتی ہے نہ دن رک سکتا ہے۔ نہ رات رکاوٹ بن سکتی ہے۔ یہ سارے انقلابات انسانی زندگی کی مختلف صورتوں پہ گزرتے ہیں۔ تعلقات باری کو یا اللہ کی طرف سے جو چیز آنے والی ہوتی ہے اس کے لیے یہ کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتے۔

مومن کیوں؟

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان

رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم نے ایک قانون ارشاد فرمایا ہے کہ ہر کام کا مدار اُس ارادے پر ہے جو کام کرنے والے کے باطن میں، اس کے دل میں، اس کے اندر اُس کام کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ چونکہ بغیر ارادے کے تو کبھی کوئی کام نہیں ہوتا اور اسی ارادے کو نیت کہا جاتا ہے۔ دنیا میں جو کچھ بحیثیت انسان ہم کرتے ہیں میرے خیال میں انسان ہونے کے ناطے کافر میں اور مومن میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ کافر بھی انسان ہوتا ہے مسلمان بھی ایک انسان ہوتا ہے اُن کی ضروریات ایک جیسی ہیں۔ ان کی خواہشات ایک جیسی ہیں۔ بنیادی طور پر سب کو ضرورت ہے کہ وہ پیسہ کمائے سب کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی صحت قائم رکھیں۔ سب کی ضرورت ہے کہ وہ اچھا گھر بنائیں، اچھی موٹر ہو اس کے پاس ضرورت کی ہر چیز ہو کہ اُن کے بیوی بچے ہوں۔ جائیداد ہو، بچوں کی اچھی تعلیم کا انتظام ہو جائے اور یہ اس طرح کی ایسی ضرورتیں ہیں جو بلا امتیاز مشرق و مغرب بلا تفریق مذہب و ملت ہر انسان کے سامنے ہیں۔

مومن ہو یا کافر ہر شخص انہی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ساری زندگی محنت، تگ و دو اور کوشش کرتا رہتا ہے۔ تو پھر یہ کفر اور ایمان کا فرق کہاں ہے۔ وجہ تفریق کیا ہے۔ مومن اور کافر میں کس وجہ سے تفریق کر سکتے ہیں یا امتیاز کر سکتے ہیں۔ دونوں کو علیحدہ علیحدہ کیسے کر سکتے ہیں۔

اُس کی سب سے بنیادی وجہ یہ ہے کہ کافر انہی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جو کچھ کرتا ہے اپنی، اپنے باپ دادا کی، ماحول اور معاشرے کی صوابدید پر کرتا ہے اپنے اردگرد دیکھتا ہے۔ اپنے باپ دادا کو دیکھتا ہے اس میں کچھ اپنی رائے اختیار کرتا ہے۔ اپنے عقل پر عمل کرتا ہے اور پھر کافر کی ساری محنت کا ماحصل جو ہوتا ہے وہ محض یہی خواہشات ہوتی ہیں لیکن مومن معاشرے کو آباؤ اجداد کی رسومات کو ان سب کے عقول کو اپنی عقل کو اپنی رائے کو ایک شخص کے قدموں میں ہار دیتا ہے اور وہ شخص ہے اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور یہ بہت بڑا فرق ہے۔

ایمان کی بنیادی شرط ہی یہ ہے مومن کے لیے سب سے پہلی اور سب سے آخری دلیل کسی کام کو کرنے کی یہ ہوتی ہے کہ یہ کام کرنے کے لیے مجھے اللہ کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے کافر کے پاس دلیل یہ ہوتی ہے کہ میرے باپ دادا ایسے کرتے تھے یا میرا عقل یا میرا دل یہ مانتا ہے کہ میں ایسا کروں یا لوگ ایسا کرتے ہیں یا ایسا کرنے سے حاصل کیا ہوگا یہاں بھی مومن اور کافر میں فرق آجاتا ہے۔ آپ کافر سے پوچھیں کہ یہ کام ہم آپنے : سنئے۔ کیا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا تو اس کا نتیجہ اُس کے سامنے دنیا کی ہی صورت میں ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر آخرت سے واقف ہی نہیں۔ کیونکہ اس زندگی کے بعد جو زندگی ہے اُس کے متعلق سوائے نبی اور رسول ﷺ کے کسی نے لب کشائی کی جرأت ہی نہیں کی۔ نہ کسی زمانے میں فلاسفہ نے اس موضوع پر بات کی نہ کسی مورخ نے، نہ کسی کیمیا دان نے، نہ کسی سائنسدان نے حالانکہ بڑے بڑے سائنس دان بھی گزرے ہیں، بڑے بڑے فلاسفر بھی گزرے ہیں۔ لیکن کسی نے بھی اس موضوع پر بات نہیں کی۔ سب کا موضوع جو ہے انسان کے دنیا میں آنے سے لے کر تب تک رہا ہے جب تک انسان کا دم چلتا رہا ہے اُس سے پہلے انسان کہاں تھا اور موت کے بعد کیا ہوتا ہے اور موت کے بعد بھی کوئی زندگی ہے اگر ہے تو وہ کیسی ہے یہ موضوع ہے انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اور نبی

کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس موضوع پر اتنی روشنی ڈالی اتنی روشنی ڈالی کہ ہم دنیوی امور میں شاید دھوکا کھا جائیں لیکن کوئی بھی مومن اُخروی امور میں دھوکا نہیں کھا سکتا تب تک جب تک وہ حضور کا اتباع چھوڑ نہیں دیتا۔

جب مومن کے سامنے آخرت ہوتی ہے اور اسے پتہ ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر کام کے دو نتیجے ہیں ایک دنیا میں ملے گا اور ایک نتیجہ آخرت میں ملے گا۔ تو مومن یہ برداشت کر لیتا ہے کہ وقتی طور پر جو نتیجہ ملتا ہے اگر یہ کڑوا بھی ہو تو جو نتیجہ دائمی ہے وہ مزے دار ہونا چاہیئے مثلاً مریض کوئی دوائی پیتا ہے تو آپ اسے دو دوائیاں دیں یہ ایک دوائی بہت مزے دار ہے میٹھی ہے لیکن اس کے پینے سے آپ کا مرض بڑھے گا چونکہ آپ پہلے شوگر کے مریض ہیں۔ اس میں بھی چینی ہے تو آپ پئیں، مزے دار بھی ہے۔ خوشبو بھی ہے ٹھنڈی بھی ہے لیکن مرض بڑھے گی۔ دوسری تلخ ہے کڑوی ہے آپ پئیں گے تو ترش ہے لیکن آپ کا مرض گھٹ جائے گا تو مریض ہمیشہ اُس تلخ کو پسند کرے گا کیونکہ وہ اُس دائمی نتیجے کو پسند کرے گا۔ جو اس کی صحت پر مرتب ہو گا۔

اِسی طرح مومن کو اگر دنیا میں نقصان بھی نظر آتا ہو کسی کام کے کرنے میں مثلاً وہ جہاد پر جا رہا ہے تو وہاں جان کے جانے کا اندیشہ ہے، وہ زکوٰۃ دے رہا ہے تو اپنے ہاتھ سے اپنا مال دے رہا ہے حج پر جاتا ہے تو اپنے پلّہ سے اپنی جیب سے رقم خرچ ہے یا اس طرح قربانی کرتا ہے تو اپنے پلّے سے اپنے جانور خرید کر اپنی رقم خرچ کر کے غرباء میں بانٹ دیتا ہے یا اور ایسے بے شمار امور یا تجارت کرتا ہے تو کافر سود لے کر خوش ہوتا ہے مومن چھوڑ دیتا ہے وہ سود نہیں لیتا۔ نقصان برداشت کر لیتا ہے لیکن وہ نقصان نہیں برداشت کرتا۔ نقصان بظاہر صرف وقتی طور پر نظر آتا ہے دائمی طور پر یا حقیقی نتیجے کے طور پر یہ اصلی منافع دے رہا ہے کہ جو دائمی اور ابدی نتیجہ ہے اُس میں مجھے منافع ہونا چاہیئے۔ کافر کی چونکہ وہاں تک رسائی نہیں ہے اُس نتیجہ سے وہ بے خبر ہے جیسے وہ مریض کہ جو اُس دوائی کے اُس نتیجے سے بے خبر ہے کہ اِس سے میرا مرض بڑھے گا۔ وہ میٹھی سمجھ کر پی لے گا۔ اسی طرح سے کافر ہر اس خواہش کی طرف لپکتا ہے جو دنیا میں لذت دے وقتی طور پر اُس کی کچھ خوش کرنے والی کیفیت اُس میں موجود ہو لیکن نتیجۃً اُس پر اللہ کی ناراضگی مرتب ہوتی ہے۔ نتیجۃً اس سے عبادت میں کمی آتی ہو۔ نتیجۃً اس سے رزق حرام ملتا ہو تو کافر ان چیزوں کی پرواہ نہیں کرے گا۔

لیکن ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہر عمل کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ جو کچھ میں کرنے چلا ہوں اس کا دائمی اور اُخروی نتیجہ کیا ہے کہ اب یہ اُخروی نتیجہ بتائے گا۔ کون اِس کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ہمارے مسلمان حکمرانوں نے جنہوں نے ایک ہزار سال تک اس برصغیر پر حکومت کی۔ اُن میں ایسے بھی تھے جو بہت دیندار بلکہ بہت پائے کے ولی اللہ بہت پائے کے فاضل بہت دیندار تھے۔ بلکہ حضرت خواجہ شمس الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا جب وصال ہوا تھا تو شمس الدین التمش حکمران تھا اس برصغیر کا دہلی پایہ تخت تھا انہوں نے یہ وصیت کی تھی بڑی مشہور وصیت ہے اُن کی کہ میرے جنازے کی نماز وہ شخص پڑھائے جس نے کبھی عصر کی سنتیں قضا نہ کی ہوں جس سے تہجد کی نماز نہ چھوٹی ہو اور ایسا شخص جس نے کبھی بغیر وضو کے آسمان نہ دیکھا ہو یعنی کبھی باہر نہ نکلا ہو۔ کہ وہ اِس حال میں ہو کہ اُس کا وضو نہ ہو تو بڑے بڑے مشائخ بڑے بڑے علماء بڑے بڑے فقہاء بڑے بڑے عابد زاہد لوگ ان کے حلقہ ارادت میں بھی تھے اور معتقدین بھی تھے اور اُن کے جاننے والے بھی تھے لیکن نماز پڑھانے کی جرأت کسی کو نہ ہوئی۔ کون ایسی شرائط پوری کرے کہ جو چیزیں مستحبات سے متعلق ہیں اُن پر بھی اتنی مداومت کہ وہ بھی کبھی نہ چھوٹی ہوں اب یہ نہ فرض ہے نہ سنت ہے نہ واجب ہے کہ ہر وقت آدمی باوضو رہے یہ تو محض اپنی کسی کی پسند بھی مجاہدہ ہے کہ وہ کبھی بھی بغیر وضو کے اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے۔ باتھ روم سے باہر نہ نکلے تو جب کوئی بھی آگے نہ بڑھ رہا تھا تو شمس الدین التمش نے نماز پڑھائی۔ کتنی عجیب بات ہے۔

جہاں ایسے لوگ تھے وہاں اکبر جیسے اَن پڑھ اور جاہل لوگوں نے بھی چالیس چالیس برس حکومت کی اور انہوں نے عوام کو ساتھ ملانے کے لیے ایک مخلوط سا تیار کر لیا جس میں ہندو مسلمان سب کو ملا کر مسلمان عورتوں کی ہندوؤں سے شادیاں کروائیں۔ ہندو عورتوں سے خود شادیاں کیں مسلمانوں کی کرائیں۔ اور بہت سی رسومات ہندوؤں کی مسلمانوں میں شامل کر دیں۔ اس طرح سے بے شمار رواجات اسلام میں آ گئے ان میں سے ایک ایسی رسم آئی ہے کہ آج تک جس سے ہم جان نہیں چھڑا سکے۔

اور وہ رسم یہ ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ولی اللہ وہ ہوتا ہے جس

کے پاس جانے سے دنیا کا کوئی نہ کوئی کام سنور جائے۔ بنیادی طور پر یہ ہندومت کا عقیدہ ہے، اسلام کا اِس سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کے پاس سب سے عظیم ہستی ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے بعد پوری امت میں عظیم ترین انسان وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضورؐ کی بعثت کے وقت سب سے پہلے کلمہ طیبہ پڑھا اور مکہ مکرمہ میں مسلمان ہوئے یعنی امت میں سب سے عظیم لوگ وہ ہیں تو آپ ان لوگوں کا تاریخ میں حال پڑھیے کیا ہوا۔ یعنی دنیا کی ایک ایک نعمت انہیں ملنے کے بجائے اُن سے چھن گئی۔ مزید ملنا تو بجائے خود رہا پہلے سے جو اُن کے پاس تھی وہ بھی چھن گئی، اُن کے گھر چھن گئے اُن کے مال چھن گئے انہیں سزائیں دی گئیں، ایذا دی گئی انہیں مارا گیا انہیں رسوا کیا گیا انہیں گلیوں میں گھسیٹا گیا، اُن پر طعن ہوتے تھے، اُن پر طنز ہوتے تھے تیرہ سال مسلسل وہ ایذ ائیں اُٹھانی پڑی اُنہیں جو تاریخ عالم میں اور کہیں نظر نہیں آتیں۔

میں ایک دن تفسیر دیکھ رہا تھا ابن کثیر تو علامہ ابن کثیر رحمت اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل فرمائی ہے میں اس پر رُک گیا، واقعی بے نظیر بات تھی، انہوں نے نقل فرمائی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں جب لوگ اُٹھیں گے عرصہ محشر میں قیامت ہوگی تو لوگ اٹھیں گے اور انہیں حساب کتاب کی طرف لے جانے والے فرشتے سر پر کھڑے ہوں گے اور ہنکا کر لے جائیں گے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہوں گے کیونکہ وہ نہایت محترم ہوں گے۔ انہیں کھینچ کر یا ہنکا کر لے جانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ بلکہ جگانے والے بھی اُن کا احترام کریں گے کوئی کچھ کہنے والا نہیں ہوگا۔ فرمایا میرے صحابہ کی ایک جماعت بھی ہوگی، تو وہ اس حال میں اُٹھیں گے کہ اُن کے وجود زخمی ہوں گے، سینے پھٹے ہوئے ہوں گے خون بہہ رہا ہوگا۔ زرہ اور تلواریں اُن کے پاس ہوں گی وہ ایک دوسرے کو دیکھیں گے اور کہیں گے چلو بھئی آؤ چلتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو ساتھ لے کر چل پڑیں گے، بجائے میزان عدل یا میدان یا حساب کتاب کی طرف جانے کے وہ جنت کے دروازے پر پہنچ جائیں گے کیونکہ جنت بھی تو پاس ہوگی۔

قرآن حکیم میں موجود ہے کہ جنت بھی دور نہیں ہوگی، پاس ہی کھڑی ہوگی، دوزخ بھی قریب لائی جائے گی جس کا جی چاہے دیکھ لیں، کہ لوگوں کو تحقیق ہو جائے کہ واقعی دوزخ بھی ہے۔

تو وہ جا کر دروازہ کھٹکھٹائیں گے جنت کا۔ حضورؐ نے فرمایا جنت کا جو ذمہ دار فرشتہ ہے رضوان یا اُس کا نام ہے وہ عرض کرے گا حضرت ابھی تو حساب کتاب نہیں ہوا، ابھی تو جو لوگ اُٹھ رہے ہیں، وہ میزان عدل کی طرف جا رہے ہیں۔ وہاں اعمال پیش ہوں گے وزن ہوگا حساب کتاب ہوگا۔ اس کے بعد فیصلہ ہوگا۔ حکم ملے گا، طے ہوگا۔ کون کہیں جگہ جائے گا، وہاں سے حکم صادر ہوگا پھر آپ تشریف لائیے گا۔ بصد شوق، ابھی تو آپ کو اُدھر جانا ہے۔ تو حضور فرماتے ہیں وہ کھڑے ہو جائیں گے۔ اور اللہ سے دُعا کریں گے کہ خدایا تیری نعمتوں کا تو شمار نہیں۔ تو نے ہمیں بے شمار نعمتیں دیں، گھر دیے اولادیں دیں، صحت دی، جوانیاں دیں، طاقت دی، دولت دی، زندگی دی۔ لیکن ہم نے اپنے پاس کچھ نہیں رکھا یہ سب کچھ ہم تیری راہ میں ہار کر آئے ہیں، اسی عالم میں جس میں تو نے یہ نعمتیں دی تھیں تو ہی گواہ ہے کہ ہم نے تیرے نبی کے قدموں میں یہ نچھاور کر دیں، اب تو ہمارے پھٹے ہوئے سینے اور کٹی ہوئی گردنیں ہیں جس پر تیرا یہ فرشتہ حساب مانگتا ہے، تو خدایا تو ہی بتا اس کو کہ ہمارے پاس بچا کیا تھا جس کا یہ حساب مانگتا ہے۔

تو حضورؐ فرماتے ہیں کہ ارشاد ہوگا اُس فرشتے سے کہا جائے گا کہ جنت کے سب دروازے کھول دو یہ ان کی مرضی ہے کہ یہ کس دروازے سے داخل ہونا چاہتے ہیں۔

بظاہر جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں وقتی طور پر لمحاتی طور پر یا فوری جو نتیجہ نظر آتا ہے اُن کی زندگی کا وہ یہ ہے کہ بعثت نبوی سے پہلے اگر اُن کے پاس کوئی سرمایہ نام کی کوئی چیز ہے گھر نام کی کوئی شے ہے اولاد نام کی کوئی شے ہے تو بجائے اس میں ترقی ہونے کے اُن کی حفاظت کا ذریعہ بننے کے زندگی ہار جاتے ہیں لیکن کیوں ہارتے ہیں، اس لیے کہ مومن اور کافر میں بنیادی فرق یہی ہے کہ مومن نبی کی نگاہ سے دیکھتا ہے، مومن ہر کام کے نتائج کو معاشرے کی نگاہ سے نہیں دیکھتا اپنے عقل کی نگاہ سے نہیں دیکھتا، آباؤ اجداد کی رسومات کی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ مومن دیکھتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ سے تو بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ اسی کام میں دنیوی منافع بھی ہوتا ہے اور اسی کام میں اُخروی منافع بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ دونوں منافع جمع نہیں ہوتے ایک طرف نقصان ہوتا ہے لیکن مومن اُخروی نقصان پہ راضی نہیں ہوتا کیونکہ وہ ہمیشہ ابدی اور پائیدار ہوتا ہے۔ اس لیے مومن وقتی اور عارضی نقصان برداشت کرتا ہے کڑوی دوائی پی لیتا ہے۔ لیکن عارضی نقصان برداشت کرتا ہے۔

اور کافر اپنی نگاہ سے اپنی رائے سے اپنی خواہشات کے تابع اپنے ماحول سے متاثر ہو کر اپنے آباؤ اجداد سے متاثر ہو کر خواہشات دنیا کے پیچھے بھاگ کر اپنی دنیا بسر کر دیتا ہے۔ یہ بنیادی فرق ہے مومن اور کافر میں۔

اب آپ خود فیصلہ کیجیے اگر ہماری نمازوں کا ماحاصل دنیا ہی رہ جائے تو میرے خیال میں ہمارے اسلام کا مزاج صحیح نہیں اگر ہماری تسبیحات، ہمارے وظیفوں کا ماحاصل دنیا ہی رہ جائے یا جنہیں ہم پیر یا فقیر یا ولی اللہ سمجھتے ہیں ان سے ملنے یا اُن کے پاس آنے جانے سے ہمیں دنیا ہی ملتی ہو تو آپ مجھے سمجھائیں کہ ہندو مت میں برہمن کا جو منصب ہے۔ عیسائی کے پاس پادری کی جو سیٹ ہے یہودی کے پاس اُس کے راہب کا جو منصب ہے اُس میں اور جو منصب ہم پیر یا مولوی کو دیتے ہیں۔ اُس میں فرق کیا ہے۔ پھر کافر میں اور مسلمان میں فرق کیا ہوا۔

اس لیے آپ کبھی بھول کر بھی اللہ کی عبادت اس غرض سے نہ کریں کہ اس عبادت کے عوض شہرت ملے گی۔ اس عبادت کے عوض مجھے دنیا ملے گی دنیا تو اُن سب کو مل رہی ہے جو اللہ کی ذات کو مانتے بھی نہیں۔ تو پھر آپ کو کیا بخار چڑھا ہے خواہ مخواہ سجدے کر کے آپ نے روٹی لی۔ پھر پیر کی کیا ضرورت ہے۔ لوگ اللہ کو نہیں مانتے اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے پاس حکومتیں ہیں۔ کیا ہندوؤں کے پاس حکومتیں نہیں ہیں یہ سارے سوشلسٹ ممالک اللہ کے وجود کے منکر ہیں ان کے پاس بڑے بڑے ملک ہیں وہ سپر پاورز بنے ہوئے ہیں تو جب خدا کا انکار کر کے بھی دنیا ملتی ہے تو پھر عبادت اور نمازیں پڑھنے اور ٹھوکریں کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر نمازیں پڑھ کر بھی دنیا ہی لینی ہے۔

بلکہ دین سے خدا خود ملتا ہے۔ اللہ کی ذات ملتی ہے اللہ کا قرب ملتا ہے اُس کی پسندیدگی ملتی ہے اور جو لذت قرب الٰہی میں ہے حقیقتاً جنت کی لذت بھی وہی ہے۔ جنت کی ساری شہرت بھی اُسی لذت پر ہے جو قرب الٰہی کی لذت ہے اور یہ جو جہنم کے عذابوں کا شور ہے اس کے پیچھے بھی یہی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے بہت دوری ہو جائے گی۔ ورنہ رحمت باری اگر دوزخ میں بھی میسر آ جائے تو وہ جنت بن جائے جہنم کے عذابوں کا شور اس لیے ہے کہ وہاں اللہ کا قرب نصیب نہیں ہوگا۔

اللہ ان سے بات تک نہیں کرے گا۔ ان کی بات نہیں سنے گا دیدار تو دور تک کی بات ہے ان کی بات تک نہیں سنی جائے گی۔ اور چونکہ اللہ کی ناراضگی کا مظہر ہے اس لیے سب سے بڑا عذاب ہی یہ ہے کہ اُس کا اللہ ناراض ہے۔

اور آپ ہرگز نہ بھولیے کہ دنیا میں کافر کو بادشاہی تو مل سکتی ہے۔ سلطنت تو مل سکتی ہے، دولت تو مل سکتی ہے۔ موٹر تو مل سکتی ہے محل تو نصیب ہو سکتا ہے۔ لیکن اُس کے دل میں سکون کا کوئی لمحہ نصیب نہیں ہوتا۔ آپ بڑے سے بڑے آدمی کی زندگی کو پڑھیں میرے خیال میں اس دور میں جتنا مضبوط آدمی سٹالن گزرا ہے شاید سوشلسٹ دنیا میں اتنا مضبوط آدمی کوئی دوسرا نہ گزرا ہوگا اور اس کے نام سے تو اُس کے زمانے میں روئے زمین کانپتا تھا لیکن اُس کا اپنا یہ حال تھا کہ وہ چوہے کی طرح زندہ رہتا تھا اُس نے لوہے کے دو تین کیبن بنا رکھے تھے زیر زمین اندر سے دروازے بند کر کے اندر زندہ رہتا تھا جب مر گیا تو پہلے دن کسی نے دروازہ کھٹکھٹانے کی جرأت نہیں کی تیسرے دن خروشیف نے دروازہ توڑا تھا تو سٹالن اندر فرش پر مرا ہوا تھا۔ یعنی آپ اُس آدمی کی زندگی کا اندازہ لگائیں جس کے نام سے ایک دنیا کانپ اٹھتی تھی۔ اس ظالم کے پنجے کے دل پر کس کا خوف سوار تھا کہ وہ ایک چوہے کی طرح لوہے کے ایک کمرے میں چھپ کر زندہ رہتا تھا اور اندر سے اسے لاک رکھتا تھا۔ اور اس بے بسی کے عالم میں مرا جب اس کی لاش انہیں ملی تو اس پر پوری وردی تھی اسے کپڑے بدلنے کا ہوش نہیں رہا دو دن تڑپتا رہا لیکن کسی نے دروازہ کھولنے کی جرأت نہیں کی۔

یہ ایک نہیں آپ ان سب کی لائف ہسٹری پڑھیں تو ان سب کی زندگی میں خوف و ہراس، اہیبت ہے۔

دلوں میں اطمینان آتا ہی اللہ کے نام اور اُس کی یاد سے ہے۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کا جو تعلق رب جلیل سے جوڑ دیا ہے اس کا ماحاصل یہ ہے کہ حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اہل مکہ نے دھوکہ سے خرید لیا۔ منافقین نے گرفتار کر کے بیچ دیا۔ آپ کے ہاتھوں بدر میں کچھ لوگ مارے گئے تھے اُن کے ورثاء نے خرید لیا اور تین مہینے تک کیونکہ اُن کے وہ دو مہینے حرمت کے تھے مہینہ ویسے وہاں تک پہنچنے میں لگ گیا دو مہینے ان کے حرمت کے

آ گئے۔ اُن کا وہ احترام کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ مہینے گزار لیں تو قتل کریں گے۔ تو وہ تین مہینے تک اُن کی حراست میں رہے تین مہینے ایک دشمن کے گھر میں اس لیے زیر حراست رہنا کہ یہ وقت پورا ہو جائے تو اسے قتل کیا جائے اس سے زیادہ کوئی اذیت ناک تصور ہے دنیا میں۔ تین مہینے بعد جب انہیں میدان میں لایا گیا سولی دینے کے لیے تو اُن سے پوچھا گیا، مرنے والے سے اُن کی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔ انسانوں کا سمندر تھا تماشا دیکھنے والوں کا کہ "تمہاری کوئی آخری خواہش ہے" تو کہنے لگے جی چاہتا ہے تھوڑی سی نماز پڑھ لوں کیسی حق تو یہ تھا تین مہینے بیٹھ بیٹھ کر شاید خدا سے بیزار ہو چکے ہوتے خدا نے میری کیا مدد کی۔ کافروں کی قید تک سے نہیں چھڑایا لیکن ان چیزوں سے وہ بے نیاز تھے قربانی کے عوض جو قرب الٰہی نصیب ہو رہا تھا وہ اُس کے طالب تھے چونکہ ان کی نگاہ نبی کریم کے ارشادات پر ہوتی تھی اور اُن نتائج پر جن کی حضور خبر دیتے تھے یہ جو مرنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھتے ہیں یہ اُن کی سنت ہے سب سے پہلے انہوں نے پڑھی تھی اور نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو اہل مکہ نے پوچھا کہ آپ نے پڑھ لی نماز فرمایا! جی تو چاہتا تھا کہ تسلی سے پڑھوں مگر مختصر کر دی کہ تم یہ نہ کہو کہ موت سے ڈرتا ہے اس نے نماز لمبی کر دی کہ مجھے مہلت مل جائے ورنہ میرا جی چاہتا تھا کہ میں تسلی سے پڑھوں۔ تو کسی نے کہہ دیا کہ اب تو تو چاہتا ہو گا کہ اپنے گھر اپنے بیوی بچوں کے پاس ہوتا اور خود محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور تم لوگوں پر مصیبت آئی کیسے کی سزا خود یہاں بھگتتا تو یہاں نہ ہوتا۔ تو وہ کہنے لگے۔ اگر مجھے بار بار زندگی ملے اور بار بار اس سولی پر لٹکنا پڑ جائے تو بھی یہ گوارا ہے اور یہ پسند نہیں ہے کہ آپ کے قدم مبارک میں کوئی کانٹا بھی چُبھ جاتے۔ فرمایا تم تو پتھر لیے پھرتے ہو تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے اور مجھے پر نگاہ کی یہ کیسے لوگ ہیں دُعا کی بار الٰہا ان ہزاروں آدمیوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو میرا پیغام لے جائے۔ لیکن تیری مخلوق تو تیرے تابع ہے تو ہوا سے ہی کہہ دے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک میرا اسلام تو پہنچا دے۔ آپ وضو فرما رہے تھے مدینہ منورہ میں۔ آپ نے فرمایا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ جو وضو کرا رہا تھا صحابی اُس نے عرض کیا یا رسول اللہ سلام کہا تو کسی نے نہیں۔ فرمایا تم نے سنا نہیں ہوا نے پہنچایا ہے۔ خبیبؓ نے سلام بھیجا ہے۔ یعنی اس حال میں بھی دل کو یہ سکون اور اطمینان نصیب ہوا اُس حال میں بھی کہ ایک دنیا پر اقتدار نصیب ہو اور دل میں اتنا خوف ہو۔ وہ کفر کا نتیجہ ہے یہ ایمان کا ثمر ہے یہ فرق ہے کافر اور مومن میں۔

لیکن یہ فرق تب ہوتا ہے جب ارادے اور نیت سے آدمی طے کر لے جو دیکھوں گا جو فیصلہ کروں گا، وہ میرا نہیں ہو گا۔ بلکہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے فیصلہ لے کر اُس پر پورے خلوص سے عمل کروں گا یہ اسلام ہے۔ اپنی رائے سے اپنے ماحول سے متاثر ہو کر باپ دادا سے رسومات لے کر دائیں بائیں سے باتیں لے کر اُن پر عمل کرنا یہ کافروں کا شعار ہے یہ فرق ہے کفر میں اور اسلام میں۔ اب ہمارے سامنے فرق واضح ہو گیا ہم میں سے ہر ایک اپنے آپ کو پرکھ سکتا ہے کس حد تک ہم اپنے آپ کو اسلام میں پاتے ہیں اور کتنا حصہ ہمارا ابھی تک کفر میں پھنسا ہوا ہے اللہ کا حکم ہے۔

تم سارے کے سارے اسلام میں داخل ہو جاؤ یہ مت کرو کہ سر اسلام میں دے رکھا ہو اور دھڑ کفر کے پاس ہو یا پاؤں اسلام میں پھنسا رکھے ہوں اور سر کافروں کے پاس ہو ایسا رویہ چھوڑ دو بلکہ سارے کے سارے اسلام میں آؤ سر سے پاؤں تک پورے کے پورے اے وہ لوگو جو ایمان کا دعویٰ رکھتے ہو جب تمہیں اللہ پر یقین ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اعتماد ہے تو پھر تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے پیچھے چلو۔

کہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ چونکہ اسلام کے باہر جو قدم بھی تم اٹھاؤ گے۔ وہ شیطان کے نقش قدم پر ہو گا۔ اور یہ مومن کو زیب نہیں دیتا شیطان کے نقش قدم پر مت چلو۔ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اعمال کا مدار اُن ارادوں، نیتوں پر ہوتا ہے جس نیت سے جس ارادے سے ہم عمل کرتے ہیں۔ اللہ ہمیں توفیق دے ہم اپنے ارادے ہم اپنی نیت کو اس طرح سے کھرا کر لیں کہ یا اللہ ہمارا یہ سفر ہمارا یہ آنا جانا ہمارا یہ مل بیٹھنا ہمارے یہ ذکر و اذکار ہمارے یہ بیان کرنا اور سننا یہ سارے کا سارا تیری رضا کے لیے تیرے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اتباع کے لیے ہو اور تو اسے قبول فرما اور ہمیں اس کی توفیق عطا فرما۔ ہمارے گناہوں اور لغزشوں سے درگزر فرما۔

قرب الٰہی

ہم اکثر سنتے ہیں، کہتے بھی ہیں اور ایک دوسرے کو تلقین بھی کرتے ہیں کہ اللہ کا قرب حاصل کیا جائے اس کے ساتھ ہمارا عقیدہ اور ایمان یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ ہر جگہ ہر آن موجود بھی ہے کوئی اُس سے پوشیدہ نہیں، کوئی چیز، کوئی ذرہ اور کوئی انسان اُس سے دور نہیں تو اس صورت میں قربِ الٰہی کا مفہوم کیا ہوگا۔ اور اگر اسے اس طرح سمجھنا یا سمجھانا چاہے تو یہ کافی مشکل خیال ہے چونکہ ہم کہتے رہتے ہیں سنتے رہتے ہیں۔ اگر اسے زیرِ بحث لایا جائے تو یہ کافی پیچیدہ سوال بنتا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے سب سے پہلی بات یہ سمجھنی پڑے گی کہ اپنی قدرت کاملہ سے اپنے قبضہ و اختیار کے اعتبار سے کوئی چیز اس کی گرفت سے باہر نہیں ہے

اُسی مخلوق میں انسان بھی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے بہت سے کردار بہت سے پہلو ہیں۔ انسانی زندگی کے متعلق خود انسان کو علم نہیں ہوتا۔ عموماً انسان کی خواہشات اُن میں مطابقت نہیں کرتیں وہ کچھ چاہتا ہے ہو کچھ اور جاتا ہے۔ وہ کچھ اور منصوبہ بندی کرتا ہے کچھ اور ہو جاتا ہے۔ پیدا ہونے میں مرنے میں امارت و غربت میں بیماری و صحت میں اس طرح سے بے شمار امور ایسے ہیں جس میں انسان باقی تمام کائنات کی طرح تقدیر کے دھارے میں ایک لڑھکتا ہوا پتھر ہے جیسے جدھر وہ چاہتی ہے الٹتی پلٹتی چلی جاتی ہے۔

البتہ انسان میں اور دوسری تخلیقات میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اور وہ ہے اللہ جل شانہٗ نے انسان کو ایک خاص عظمت عطا فرمائی ہے اور یہ شعور عطا فرما کر وہ اپنی حیثیت کے مطابق اللہ جل شانہٗ کی جلالت اُس کی عظمت اور کبریائی کو سمجھ سکتا ہے اور یہ فیصلہ کرتا ہے کہ بے شک کائنات میں حُسن بھی ہے لذتیں بھی ہیں راحتیں بھی ہیں بہت سی نعمتیں ہیں لیکن کوئی بھی اتنی بڑی نعمت نہیں ہے جس میں محو ہو کر میں ربِ جلیل کو فراموش کر دوں یا جس نعمت کے حصول کے لیے میں اللہ کی نافرمانی کر دوں یا اللہ جل شانہٗ کی رضا کے بغیر اُس کی خوشنودی لیے بغیر ہاں اللہ نے انسان کو اختیار دیا ہے روزی تو اُس نے مقدر کر دی ہے۔ لیکن حصولِ رزق کے ذرائع اختیار کرنے کا شعوری طور پر اختیار انسان کو دے کر ایک طریقہ بھی تعلیم فرما دیا اس طریقے سے حاصل کرو کہ رزق بھی حاصل کر لو گے اور اس کے ساتھ تمہیں میری خوشنودی میری رضا مندی بھی حاصل ہو گی۔ لیکن اگر اس کے علاوہ کرو گے تو میں تمہارا ہاتھ نہیں روکوں گا۔ تمہیں جو قوت دی ہے چھین نہیں لوں گا۔ نگاہ بند نہیں کر دوں گا۔ مگر ہوگا یہ کہ اس کے علاوہ جو طریقہ حصولِ رزق میں اختیار کرو گے اس سے حاصل کیے جانے والے رزق ایسے ہو گا جیسے کوئی کسی کی چوری کر کے کھائے۔

ایک آدمی کسی سے انعام لیتا ہے دوسرا اُس کے گھر میں چوری کر لیتا ہے مزدوری کر کے لینے والا یا انعام لینے والے اور چوری کرنے والے میں جو فرق ہے وہ اطاعت کرنے اور نہ کرنے والے میں فرق ہو گا۔ رزق دونوں کو مل جائے گا۔ اب یہ شخص جس نے اطاعت کا پہلو اختیار کیا اور نافرمانی سے اجتناب کیا۔ اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت پر کاربند کر دیا اُس اطاعت کے بدلے میں اُسے جو اللہ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل ہوئی۔ اُسے اصطلاحاً قربِ الٰہی کہا گیا یعنی قرب سے مراد وہ تقرب حاصل ہے جس میں اللہ کی خوشنودی اللہ کی پسندیدگی اللہ کی رضا حاصل ہو جیسے کوئی شخص گرفتار ہو کر شاہی دربار میں پیش ہوتا ہے تو وہ بھی دربار میں کھڑا ہے۔ اور کسی شخص کو دربار میں وزارت کا منصب یا وزارت کی کرسی دی جاتی ہے تو وہ بھی دربار میں ہے اُسی کمرے میں وہ بھی موجود ہے لیکن وہ جسے کرسی دی گئی وہ مقربِ بارگاہ ہے اور جو گرفتار ہو کر باعتبار مادی فاصلوں کے باعتبار جسم کے تو قریب ہے لیکن معنوی اعتبار سے وہ چونکہ غضب کا شکار ہے اس لیے اسے وہ قرب حاصل نہیں جس میں رضا بھی شامل ہوتی ہے اگرچہ وہ قریب ہے لیکن اُس کا قریب ہونا بھی اُس کے لیے نقصان دہ ہے جو نافرمانی کرتا ہے اللہ جل شانہٗ کی ذات سے یا اللہ جل شانہٗ کے علم سے یا اللہ جل شانہٗ کی قدرت کاملہ سے یا اُس کی کائنات سے دور تو وہ بھی نہیں ہو جاتا۔ نیکی کرنے والا قریب ہو جاتا ہے اور نہ کرنے والا دور ہو جاتا ہے یہ بات نہیں ہوتی۔

فرق قربِ الٰہی میں اور عدمِ قربِ الٰہی میں یہ ہوتا ہے کہ جو اطاعت کا رستہ اختیار کرتا ہے اس پر انعامات اور اللہ کی رضامندی

ہوتی ہے وہ اُسے مقرب بارگاہ بنا دیتی ہے اس خوشنودی اور انعام کے ساتھ جو تقرب حاصل ہوتا ہے۔ اسے قرب الٰہی کہا جاتا ہے اور اس کے حصول کا حکم دیا گیا ہے۔

ایمان لانے کے بعد اعمال صالح پہ کار بند ہو جانے کے بعد جو اُس سے پہلے کوتاہیاں ہو چکیں جو ایمان لانے سے پہلے کی خطائیں ہیں اُن کا مواخذہ نہیں ہوتا ایمان لانا بجائے خود اتنا بڑا فعل ہے اتنی بڑی نیکی ہے اتنی بڑی عبادت ہے کہ جب وہ کفر تک کو مٹا دیتا ہے تو کوئی بھی گناہ کفر تو نہیں ہوتا گناہ تو گناہ ہوتا جب ایمان لانے سے کفر کی ظلمت مٹ جاتی ہے تو گناہ کی ظلمت کیسے باقی رہ سکتی ہے قبل اسلام کے جو جرائم ہیں ان کے لیے تو اُس کا ایمان لانا اسلام میں داخل ہونا کفایت کرتا ہے لیکن ایمان لانے کے بعد شرط یہ ہے کہ وہ نیکی اختیار کرے عمل صالح کو اپنائے۔

عمل صالح اور نیکی ایک اثر پیدا کرتی ہے اور نیکی کا اثر ہوتا ہے تقویٰ یعنی اللہ جل شانہ سے ایک ایسا تعلق کہ نافرمانی کرتے ہوئے یا کوتاہی کرتے ہوئے یا اللہ جل شانہ کے احکام سے روگردانی کرنے کا آدمی سوچتے ہوئے بھی شرم محسوس ہو کہ میرے لیے یہ بات مناسب نہیں۔ ایسا تعلق قائم ہو جاتا ہے اللہ اور اُس کے بندے کے درمیان اور یہی وہ سب سے قیمتی چیز ہے۔ یہی وہ سب سے بڑا اہم کام ہے جو انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام انجام دیتے ہیں مخلوق کو خالق سے اس طرح آشنا کر دیتے ہیں کہ یہ مشت خاک براہ راست رب العالمین سے استفادہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اپنی گذارشات براہ راست پیش کرتا ہے اطاعت براہ راست اُس کی کرتا ہے اور اُس کے قرب کے لیے سارا مجاہدہ ساری محنت اُسی کی رضامندی کے لیے ساری کوشش وقف کر دیتا ہے۔ فرمایا جب وہ ایمان لاتا ہے اُس کے ساتھ ایمان کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ عمل صالح کرے۔ اور عمل صالح کی سادہ سی وضاحت ہے۔

ہر وہ عمل صالح ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق ہے۔ جو خلاف سنت ہے اس میں صلاحیت نہیں۔ ایمان اور اطاعت پیغمبر سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔ فرمایا جب تقویٰ پیدا ہوتا ہے تو تقویٰ ایمان میں مزید زیادتی کا سبب بنتا ہے۔ یعنی وہ ایمان جو اسے نصیب ہوا تھا اُس میں مزید پختگی آتی ہے۔ مزید قوت آتی ہے اُس کا یقین اور مستحکم ہوتا ہے اور اسے یقین کا استحکام اسے مزید متقی بنا دیتا ہے

ایک صحابی کو ایک یہودی نے کفار سے چھڑایا تھا۔ قتل ہونے سے بچایا تھا۔ یہود و مدینہ کو جب قتل کی سزا دی گئی بنو قینقاع کو تو اس یہودی نے صحابی کو تلاش کر لیا۔ وہ ایک غریب آدمی تھے اُس نے انہیں یاد دلایا کہ میں تمہیں مشکل وقت میں کام آیا تھا آج مجھ پر مشکل وقت ہے آج تمہیں چاہیئے کہ میری مدد کرو وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا عرض کی یا رسول اللہ ایک یہودی ہے جنہیں ویسے تو قتل کا حکم ہو چکا ہے لیکن مجھ پر اُس کا یہ احسان ہے کہ اُس نے ایک دفعہ میری جان بچائی تھی اور وہ مجھ سے پناہ کا طالب ہے آپ نے فرمایا تم اُسے پناہ دے دو اُسے قتل نہیں کیا جائے گا وہ بڑا خوش ہو گیا اُس نے اُسے جا کر اطلاع دی اُس نے کہا کہ ہم پر سزا یہ لگائی گئی ہے کہ مردوں کو قتل کر دیا جائے اُن کا مال بیت المال میں داخل کر دیا جائے اور ان کی خواتین اور بچے کنیزیں اور غلام بن جائیں۔ جب میرا مال بیت المال میں چلا جائے گا بچے اور خواتین جو ہیں وہ غلام اور کنیزیں بن جائیں گی تو میرے زندہ رہنے کا کیا فائدہ۔ اُس نے پھر یہی بات جا کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ وہ تو یہ کہتا ہے آپ نے فرمایا تم اُسے کہو اپنا مال بھی لے جاؤ اپنی خواتین بھی لے جاؤ اور اپنے بچے بھی لے جاؤ اُس نے آ کر حضور کا پیغام غلام کو سنا دیا جو اُس پر مامور تھے اور عمل درآمد کرتے تھے تو اس میں وقت لگا جن پر سزا کی اُس پر عمل درآمد ہو رہا تھا اُس نے تلاش کیا اپنے بیوی بچوں کو پھر اُس نے اپنے گھر کے سامان کو تلاش کیا پھر اُس نے اُن کے لیے کوئی سواری کا بندوبست کیا بچے اپنا گھر کا سامان اونٹوں پر لادا، بچے، بیوی، اہل خاندان کو بٹھایا اور انہیں پتہ بتایا کہ تم فلاں جگہ خیبر میں اپنے رشتہ دار کے پاس چلی جاؤ یہ راستہ جاتا ہے یہ رشتہ دار ساتھ ہیں تمہارے یہ جانتا ہے اپنا انتظام کر کے پھر وہ واپس پہنچا تو ایک خندق کھودی گئی تھی جن پر سزائے موت جاری تھی انہیں قتل کر کے پھینک دیا جاتا تھا تو اُس خندق پر پہنچ کر اُس نے اُن یہودی سرداروں کے متعلق جو اُس قبیلے کے تھے اُن کو پوچھا کہ فلاں کا کیا حال ہے بتایا گیا وہ قتل ہو چکا ہے فلاں کا کیا حال ہے وہ بھی قتل ہو چکا ہے فلاں کا کیا حال ہے وہ بھی قتل ہو چکا ہے تو اُس نے صحابی سے کہا کہ آپ نے مجھ پر بہت احسان کیا میں نے صرف آپ کی جان بچائی تھی آپ

نے میرا سارا خاندان بچا لیا۔ یہ تو درست ہے لیکن جب ایسے لوگ قتل ہو گئے تو اُن کے بعد زندہ رہنے کا کیا فائدہ۔ لہٰذا مجھے قتل کر دیا جائے میں واپس نہیں جاؤں گا اور اُس کو قتل کر دیا گیا اُس پر سزا جاری ہوئی اُس نے کہا کہ میں کسی کی پناہ میں نہیں آنا چاہتا جب اُس نے کہا تو سزا جاری ہو گئی۔

کافر بھی انسان ہوتا ہے۔ انسانوں کے انسانوں کے ساتھ ایسے تعلق پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ اُن کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتے یہ تاریخ کا حصہ ہوتا ہے۔

آپ اپنے ملک میں دیکھیں کہ بعض لوگوں کے لیے لوگ مر جاتے ہیں زندہ جل جاتے ہیں۔ جنرل مرحوم کی شہادت پر ائیں نے متعدد اخبار میں خبریں پڑھیں واللہ اعلم خبر ٹھیک ہو یا نہ ہو) کہ لوگوں نے جان دے دی۔ اس کا مطلب ہے شاید جنرل صاحب انہیں جانتے بھی نہ ہوں۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ یہ اُن سے واقف بھی تھے یا نہیں۔ اُن کے نام بھی انہیں پتہ تھے یا نہیں۔ کبھی انہیں ملے بھی تھے یا نہیں لیکن ایک عقیدت ایک تعلق قلبی انس لوگوں کو تھا۔

تو اس طرح کا تعلق جب رب العالمین سے ہو جائے کہ آدمی اس سطح پہ چلا جائے کہ جیسے نافرمانی کا تصور ہوا سے یہ محسوس ہو کہ میں اللہ کے روبرو کھڑا ہوں۔ میرا اللہ میرے پاس موجود ہے اُسے یقین ہو اللہ تو ہر جگہ موجود ہے لیکن عمل کرنے والے کا بھی ایمان ہو جب عمل کرنے والے کو یہ یقین پیدا ہو جائے تو اسے تقویٰ کہتے ہیں اور جسے تقویٰ نصیب ہو جائے وہی مقرب الٰہی اور اُسی کو اصطلاحاً قرب الٰہی کہتے ہیں۔ یوں تو ہر شخص اُس کی قدرت کاملہ پر زندہ ہے۔ اُس کی دی ہوئی نعمتیں کھا رہا ہے اُس کی قدرت کاملہ سے باہر نہیں ہے۔

تو فرمایا ایمان کی خاصیت عمل صالح اور عمل صالح سے تقویٰ کی خصوصیت پیدا ہوتی ہے اور تقویٰ جو ہے جب یہ تقویٰ آتا ہے تو تیقن اور ایمان میں مزید پختگی پیدا ہوتی ہے اور ایمان میں جب مزید پختگی آتی ہے تو وہ تقوے میں مزید پختگی پیدا ہوتی ہے اور جب تقویٰ اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔

تو پھر آدمی درجہ احسان کو پا لیتا ہے۔ درجہ احسان کی شرح جو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی وہ یہ ہے۔ اس میں صرف سجدہ یا صلوٰۃ مراد نہیں ہے عبادت سے مراد تو اطاعت الٰہی ہوتا ہے زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی اطاعت اس طرح کرنا جس طرح اللہ کے روبرو تو سب کچھ کر رہا ہے تیرا کوئی لمحہ ایسا نہ ہو رب العالمین کی عظمت تیری نگاہوں سے پنہاں ہو۔ فرمایا جب آدمی کو یہ مقام حاصل ہو جائے تو پھر وہ محبوبان بارگاہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ جسے درجہ احسان حاصل ہو جائے وہ اللہ کی بارگاہ کا مقرب اور محبوب بن جاتا ہے۔ تو یہ وہ قرب الٰہی ہے جسے ہم کہتے بھی ہیں سنتے بھی ہیں سناتے بھی ہیں لیکن سمجھنا تھوڑا سا پیچیدہ سا لگتا ہے۔

اصل مراد یہ ہے کہ اندر کوئی ایسی کیفیت کوئی ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ آدمی کسی حال میں بھی اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس۔ آپ کسی درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے تو کوئی کافر پاس سے گذرا۔ اس نے تلوار کو نکال لیا اُس نے سمجھا کہ نزدیک تو کوئی آدمی نہیں ہے۔ اُس نے کہا کہ اب آپ فرمائیے میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے آپ نے کہا اللہ۔ تو صرف اللہ کہنے میں اتنی جلالت جاری تھی اُس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ تلوار گر گئی اور حضورؐ نے اُٹھا لی۔ اور فرمایا اب تو بتا کہ تجھے کون بچائے گا۔ کہنے لگا کوئی نہیں بچا سکتا فرمایا۔ تو بھی کہہ دے اللہ تم بھی تو اللہ کے بندے ہو مجھے بچا سکتا تجھے بھی بچا سکتا ہے۔ تم بھی کہہ دو اللہ بچائے گا۔ تم کیوں نہیں کہتے تو اس کا ششدر رہنا اس لیے تھا کہ اُسے وہ تیقن وہ تعلق وہ چیز حاصل نہ تھی۔ مگر نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا اُس کی حیثیت کے مطابق اُس کے دل میں بھی اُنڈیل دیا۔ یہ بڑا کام ہے جس کے لیے انبیاء و رُسل آتے ہیں۔

آدمی جب درجہ احسان پر فائز ہوتا ہے تو اُس کا ہر عمل اس لیے اللہ کے روبرو ہو جاتا ہے کہ کوئی لمحہ یاد الٰہی کے سوا خالی رہتا نہیں ہر آن اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے۔ اس لیے صوفیا نے یہ طریقہ اپنایا ہے کہ جس درخت پر جو پھل لگتا ہے اُسی پھل کو اگر بو یا جائے تو وہی درخت حاصل ہوتا ہے اگر ذکر الٰہی کو ہی اپنا لیا جائے تو اللہ کی مہربانی سے یہ سارا درخت جو اس سے اُگ رہا ہے ایمان کامل بھی نصیب ہو جائے عمل صالح بھی نصیب ہو جائے درجہ احسان بھی نصیب ہو جائے انسان کو ہر آن بارگاہ الوہیت کی حضوری حاصل ہو یہ ہے آسان سی قرب الٰہی کی تعریف۔

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان

اَصحابِ کَہف

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے بنو اسرائیل میں یہ لوگ گزرے ہیں۔ جنہیں اصحاب کہف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کہف کا معنی غار ہوتا ہے۔ اصحاب کہف انہیں اس لیے کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک غار میں پناہ لی تھی اور وہی غار ان کا دائمی قیامت تک ٹھکانہ بنی۔ پھر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ اصل کے ساتھ بے شمار قصے کہانیاں، حکایات شامل ہوتی گئیں۔ اور بنی اسرائیل کی مختلف قوموں نے مختلف ادوار میں مختلف رنگ چڑھائے ہر ایک عجیب وغریب واقعہ بن گیا۔ جس کا کوئی سرا نہیں ملتا۔

جب آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے تو اگرچہ سارے ہی کفر کو آپ کی بعثت سے تکلیف ہوئی۔ ہر طرح کے کفر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن سب سے زیادہ جو ایذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی۔ جو معاندانہ کوشش اسلام کے راستے میں کی گئیں دین کو روکنے کے لیے کی گئیں، ان میں سب سے زیادہ حصہ یہود کا تھا۔

یہود کے علماء مدینہ منورہ میں رہتے تھے تو مکہ سے مشرکین مکہ مدینہ منورہ آتے اور یہاں وہ انہیں مختلف سوال تعلیم کرتے۔ یہ سوال کر دیا اعتراض کرو۔ یہ جا کر کہو۔ ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ اصحاب کہف کے متعلق سوال کرو اگر وہ اللہ کے نبی اور رسول ہیں تو اللہ انہیں بتا دے گا۔ ورنہ تو کسی کے علم میں یہ بات نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو غلط یا صحیح جو واقعات ہیں وہ یہود کے پاس ہیں یا علماء کے پاس ان کی کتابوں میں تھے۔ عام آدمی تو نہیں جانتا تھا۔

تو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ کریم نے ان کے اصل حالات جس قدر ضروری سمجھے وہ ارشاد فرما دیئے۔ کیونکہ قرآن بنیادی طور پہ ہدایت کی کتاب ہے۔ تاریخ قرآن کا موضوع نہیں ہے کہ یہ تاریخ بیان کرے۔ اس کا موضوع انسان اور مخلوق کے خالق کے ساتھ تعلقات اور ان کے لیے انسان کی ہدایت کے اسباب کو زیر بحث لاتا ہے۔ اور اس کے اصلاح کے ذرائع کو تاریخ بھی اپنے پہلو میں اپنے نتائج کے اعتبار سے بہت سی تنبیہات اور بہت سی قابل تقلید باتیں رکھتی ہے یا ایسے نمونے رکھتی ہے جن کو اپنا کر انسان کامیابی کا راستہ اپنا سکتا ہے یا ایسے نمونے رکھتی ہے کہ ان سے بچ کر انسان بے شمار فوائد حاصل کر سکتا ہے۔

تو جہاں کسی تباہی سے بچانا مقصود ہوتا ہے وہاں کسی

قوم کا وہ کردار بیان کر دیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ تباہ ہونے یا یہاں کسی کامیابی کی طرف رہنمائی مقصود ہوتی ہے تو وہاں کسی نہ کسی ایسی قوم کا تذکرہ بھی فرما دیا جاتا ہے جنہوں نے اس کامیابی کو کسی طریقے سے حاصل کیا اور وہ طریقہ ارشاد فرما دیا جاتا ہے۔

اصحاب کہف غار میں پناہ لینے والے معمولی آدمی نہیں تھے بلکہ پوری قوم شرک میں مبتلا ہو گئی۔ کفر میں مبتلا ہو گئی۔ دین سے منحرف ہو گئی۔ لیکن چند نوجوان ہدایت پر قائم رہے اور انہیں ایسی استقامت نصیب ہوئی کہ انہوں نے حکومت کی پرواہ کی نہ پوری قومی طاقت کی نہ اپنے ذاتی مفادات کو کسی طرح اپنے سامنے رکاوٹ بننے دیا نہ ان تکالیف کی پرواہ کی جو اس راستے میں انہیں آئیں۔ بلکہ ان کے سامنے ایک نصب العین رہا اور وہ یہ کہ ہمارا جو تعلق رب کریم سے ہے اُسے مجروح نہ ہونے دیا جائے اس کے علاوہ باقی جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے وہ قربان کرنا پڑے تو ہم اسے قربان کر دیں گے اور انہوں نے یہ کر دکھایا۔ گھر چھوڑ دیا۔ مال جائیداد۔ دوست احباب۔ بیوی بچے، رشتہ دار سب چھوٹ گئے۔ حکومت کی مخالفت جان کا خطرہ یہ سب کچھ انہوں نے برداشت کیا پھر آزادی چھوٹی۔ جنگل میں پناہ لی اور جنگل میں بھی بغیر اسباب کے جہاں کوئی کھانے کا ذریعہ نہیں ہے کوئی پینے کا سبب نہیں ہے۔ کوئی رہائش کے ظاہری اسباب نہیں ہیں۔ محض ایک غار میں پناہ لی کہ جس کے لیے ہم سب کچھ چھوڑ رہے ہیں۔ وہ قادر ہے ہمارا سارا اہتمام وہی کرے گا۔

اتنا بڑا اکام ہوا کیسے کہ ایک پوری قوم، پوری سلطنت، پورا ملک ایک ڈگر پر چل پڑتا ہے اور ان میں آٹھ دس یا پانچ آدمیوں کی کیا حیثیت ہے۔ کیا قوت ہے جو ان پانچ یا سات آدمیوں کو ایک مسلک پر یا ایک موقف پر قائم رکھتی ہے۔ انسان بہت سی ضرورتوں کا محتاج ہے۔ طبعاً تمدنی طور پر فطری طور پر اسے لباس کی ضرورت ہے۔ غذا کی ضرورت ہے۔ دوستوں کی ضرورت ہے۔ والدین کی شفقت چاہیئے۔ اولاد کی محبت چاہیے۔ گھر چاہیئے۔ خاندان چاہیئے یہ کچھ نہیں چھوڑ سکتا۔ بہت مشکل ہے۔ ایک ایک ذرے سے محبت ہوتی ہے۔ جسے یہ اپنا کمایا ہوا مال سمجھتا ہے خواہ اس میں جوتی ہو کپڑا ہو۔ پیسہ ہو۔ پانی ہو، سونا ہو۔ مکان ہو، زمین ہو یا جائیداد ہو اگر امیر آدمی کے پاس کوئی بہت قیمتی اثاثہ ہے اسے وہ بہت محبوب ہے جتنی کسی امیر کو قیمتی چادر پسند ہوتی ہے۔ پھر انسان زندگی کے ذرائع کا محتاج ہے۔ اسے کھانا چاہیئے، پانی چاہیئے۔ بستر چاہیئے۔ گرمی سردی سے بچاؤ کے لیے، پناہ کے لیے، بارش سے، دھوپ سے، ان چیزوں سے بچنے کے لیے مکان چاہیئے یہ سب کچھ چھوڑ دے تو یہ کیسے رہے گا۔

اگر یہ سب کچھ اس قیمت پر ملتا ہو کہ تم اپنے مالک کو اپنے پروردگار کو، ان تعلقات کو جو تمہارے رب العالمین کے ساتھ ہیں انہیں چھوڑ دو تو یہ سب کچھ ملے گا۔ تب انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان سب کے لیے ہم اللہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ان سب کو چھوڑ دیں گے۔ اس لیے کہ یہ سب اس کی دین ہے۔ ان تعلقات کے نتیجے میں اللہ انہیں مل سکتا۔ لیکن اللہ کریم قادر ہے کہ وہ ایسی چیزیں بار بار بھی دے سکتا ہے۔ یہ پہلے بھی اس نے دیں۔ پھر بھی وہی قادر ہے وہ ان چیزوں کے بغیر بھی زندگی دینے پہ قادر ہے اور ان کے بغیر بھی گزارہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اللہ سے تعلق چھوڑ دیا جائے۔ تو گزارہ نہیں ہو سکتا۔

یہ اتنا بڑا فیصلہ انہوں نے کیسے کر لیا اللہ کریم فرماتے ہیں۔ ہم آپ کو کھری کھری بات سناتے ہیں۔ صاف صاف ہم قصے کہانیوں سے، حکایات سے، پاک جو اصل بات تھی وہ ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ چند نوجوان تھے اور اپنے رب کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں بنیادی طور پر انہیں اپنے پروردگار پر یقین تھا۔ اللہ نے اس کے اس یقین کو بڑھا دیا۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہوتا ہے۔ یہ انسان نہیں کر سکتا۔ انسان تو ایک پائی بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ انسان تو ایک لمحہ ات کا قربان نہیں کر سکتا۔ لیکن جب انسان کے دل میں یقین کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو پھر اللہ کریم اپنی طرف سے اسے وہ قوت عطا فرما دیتے ہیں وہ تعلق جو اسے اللہ سے پیدا ہوتا ہے اسے اتنا عزیز ہو جاتا ہے کہ اس پر پھر ساری دنیا کو قربان کر سکتا ہے اسی کو تعلق کہتے ہیں۔

اسے اصطلاح تصوف میں رابطہ کہتے ہیں یعنی بنیادی سبق جو ہوتا ہے۔ اللہ اللہ کا۔ اسے کہتے ہیں رابطہ۔ جو آپ بنیادی مراقبہ کرتے ہیں لطائف کے بعد پہلا مراقبہ جو کیا جاتا ہے آدمی قلب پر متوجہ ہو کر بیٹھے اور یہ خیال کرے کہ قلب سے جو انوارات اٹھتے ہیں وہ عرش عظیم تک جاتے ہیں۔ سفید رنگ کا نور قلب کی ہر دھڑکن کے ساتھ قلب سے اٹھ کر عرش عظیم سے قائم ہو جاتا ہے۔ پھر یہ مضبوط ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جب یہ مضبوط ہوتا ہے تو روح

کے سفر کے لیے سیڑھی بن جاتی ہے۔ منازل کے درمیان واسطہ بن جاتا ہے۔

تو اللہ کریم فرماتے ہیں یہ رابطہ قلب جو ہے ان کے دلوں کے ساتھ ہم نے اپنا یہ تعلق اپنا یہ رابطہ اپنا یہ رشتہ اپنی طرف سے وہبی طور پر انہیں عطا کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ثمرات ہمیشہ وہبی ہوتے ہیں یعنی آپ مجاہدہ جو کرتے ہیں وہ آپ کے ذمے ہے ہم جو محنت کرتے ہیں وہ ہمارے ذمہ ہے لیکن اس پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اس پر جو پھل لگتا ہے وہ عطائی ہوتا ہے وہ وہبی ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس میں کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ میں نے زیادہ دیر مراقبہ کیا اب پر زیادہ پھل لگنا چاہیے یا اس نے تھوڑی دیر کیا اس پر تھوڑا یہ اس کی مرضی کہ کسی نے چند دن محنت کی ہے اس پر زیادہ پھل آتا ہے۔ کسی نے کئی سال محنت کی ہے اس پر تھوڑا پھل آتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے یہ اس لگانے والے کی مرضی ہے میری اور آپ کی مجال نہیں ہے۔ ہم ایک درخت لگاتے ہیں اسے پانی دیتے ہیں اس کی رکھوالی کرتے ہیں۔ اسے کھاد دیتے ہیں، ساری محنت اس کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس پر پھل لگانا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

اسی طرح یہ جو باطنی ثمرات ہوتے ہیں ثمرات ہمیشہ وہبی ہوتے ہیں۔ پھل ہمیشہ اللہ کی طرف سے لگتا ہے۔ محنت مجاہدہ انسان کی طرف سے ہوتا ہے۔

یہاں ان کا مجاہدہ یہ تھا کہ ساری قوم کفر کی طرف چلی گئی۔ لیکن انہوں نے ایمان کا دامن نہیں چھوڑا۔ انہوں نے کہا یہ بات درست نہیں جو کچھ تم کر رہے ہو ہم نہیں کریں گے۔ مخلوق کے سامنے نہیں جھکیں گے بادشاہ کو ہم اپنا پروردگار نہیں مانیں گے ہمارا رب تو وہی ہے جس نے ہمیں پیدا کیا وہ ہم جیسا انسان ہے اسے ہم کیسے پروردگار مان لیں۔ اور یہ بات انہوں نے ایک پوری سلطنت ایک پوری ریاست اور حکومت کے سامنے کہی۔ یہ بہت بڑا مجاہدہ تھا۔ معمولی بات نہیں تھی یہ چند آدمی ایک بہت بڑی سلطنت، حکومت، حاکم وقت اور پوری قوم کے سامنے اعلان کر دیتے ہیں کہ تم اگر اللہ کو چھوڑ کر جا رہے ہو تو ہم تمہارا ساتھ نہیں دیں گے ہم اللہ کا دروازہ نہیں چھوڑیں گے۔

اللہ کریم فرماتے ہیں ان کی یہ بات مجھے ایسی پسند آئی۔ میں نے اپنا رابطہ ان کے دلوں کے ساتھ مضبوط کر دیا پہلے تو ان کا ایمان تھا ان کا یقین تھا۔ پھر اس سے بڑھ کر میں نے انہیں وہ دولت عطا کر دی کہ ان کے قلوب کا رابطہ ہو گیا۔ میری ذات کے ساتھ اور جب یہ رابطہ ہو گیا تو ان میں اور جرأت آگئی وہ کھڑے ہو گئے انہوں نے اعلان کر دیا۔

انہیں ان لوگوں کی حیثیت نظر نہ آئی۔ ان کا دل اللہ کے نام پر دھڑکتا تھا۔ کسی کی کیا پرواہ، وہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار تو وہ ہے جو آسمانوں کا رب جو زمینوں کا رب ہے۔ ہم تو اس کے بغیر کسی کو معبود نہیں مانتے، اس کے بغیر کسی کے سامنے سجدے کے لیے نہیں جھکتے۔ کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔ اس کی اطاعت چھوڑ کر کسی دوسرے کی اطاعت نہیں کریں گے اور اگر خدانخواستہ ہم بھی کرنے لگ جائیں، خدانخواستہ ہم بھی تمہارے ہمنوا ہو جائیں۔

تو ہم بھی غلط کہنے والے ہوں گے پھر بھی تم معبود برحق نہیں بنتے ہو۔ یہ نہیں ہے کہ ہمارے ماننے سے تم معبود بن گئے ہو، تم معبود ہو بھی نہیں سکتے۔ ہم اگر تمہیں مان بھی لیں گے تو ہم بھی گمراہ ہو جائیں گے۔ یہ نہیں ہو گا کہ ہم تمہیں مان لیں گے تم معبود برحق ہو جاؤ گے تم تو معبود ہی نہیں عبادت کے لائق تو وہ اکیلا ہے اگر خدانخواستہ ہم بھی مان لیں تو ہم بھی تباہ ہو جائیں گے ہم بھی جھوٹ کہنے والے ہوں گے۔ پھر ہم تباہی میں کیوں پڑیں۔

اور فرمایا۔ یہ دیکھو قوم کا فیصلہ دیکھو قوم کی رائے دیکھو ان کا شعور دیکھو، اللہ کے احسانات دیکھو ان کے پاس ملک ہے دولت ہے، حکومت ہے۔ اولاد ہے اموال ہیں، دنیا کی ہر لذت ہے۔ اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی رضامندی کی تلاش، اللہ کو ناراض کر کے دوسروں کو راضی کرنے کا راستہ اپنا لیا ہے۔

اگر ان کے پاس اس بات کے حق ہونے کی کوئی دلیل ہے تو کیوں نہیں لاتے۔ ہمیں یہ محض حکم کیوں دیتے ہیں۔ ہمیں یہ محض ڈراتے کیوں ہیں۔ تم مانتے نہیں ہو تو تمہیں قتل کر دیں گے۔ مانتے نہیں ہو تو تمہیں گھر سے نکال دیں گے، مانتے نہیں ہو تو تمہیں سزا دیں گے۔ یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ اس بات پر

دلیل پیش کیوں نہیں کرتے کہ اللہ کی اطاعت کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی اطاعت کیوں کی جائے جبکہ کوئی دوسرا اللہ کے مقابلے میں عبادت کے لائق نہیں۔

عبادت اسی کو کہتے ہیں کہ اللہ کی اطاعت کے مقابلے میں کسی کی اطاعت کی جائے تو وہ عبادت ہو گی۔ فرمایا! اس سے بڑا ظلم اور دنیا میں کیا ہو گا کہ اللہ پر ہی جھوٹ باندھے بے شمار گناہ ہیں۔ بے شمار برائیاں ہیں۔ ہر برائی ایک ظلم ہے۔ لیکن اس سے بڑی برائی اس سے بڑا ظلم کوئی تصور نہیں کہ کوئی اللہ پر جھوٹ باندھے، گناہ کو ثواب کہے، برائی کو بھلائی کہے یا نیکی کو چھوڑ دے۔ اللہ کے بغیر کسی کو معبود مانے یا کوئی غلط کام کرے اور اس کے بھلا ہونے کا یا اس کے اچھا ہونے کا اعلان کرے۔

فرمایا! انہوں نے آپس میں یہ فیصلہ کیا کہ ہماری بات ان پر اثر نہیں کرتی یہ ہماری بات نہیں مانتے۔

ان سے علیحدہ ہو جانا ہی بہتر ہے۔ کم از کم ہم ان کے ساتھ شامل تو نہ ہوں۔ چونکہ ہمارا دین علیحدہ ہے ہمارا عقیدہ علیحدہ ہے ہمارا ایمان علیحدہ ہے۔ تو پھر یہ اپنے دین پر رہیں۔ تم ان سے علیحدہ ہو جاؤ۔ اور جن کی یہ عبادت کرتے ہیں انہیں چھوڑ دو سوائے اللہ کے سب کچھ چھوڑ دو ہم اللہ کی طرف چلتے ہیں۔ کسی غار میں بیٹھ جاتے ہیں۔ تمہارا پروردگار اپنی رحمت سے تمہارے لیے اسباب پیدا کر دے گا۔ گھر چھوٹ گیا، مکان چھوٹ گئے اسباب چھوٹ گئے تو ان سب کو نہیں دیکھتے ہمارے پاس دنیاوی اسباب نہیں ہیں کہ ہم ان سے لڑ کر لے لیں چھین کر لے لیں، زبردستی لے لیں۔ اگر ہم ان چیزوں کے پیچھے چلتے ہیں یہ ہمیں کفر میں مبتلا کیے بغیر قبول نہیں کرتے یہ ہمیں ایمان پر نہیں رہنے دیتے۔

قرآن حکیم بیان فرماتا ہے، ہوتا یہ ہے کہ جب موت آتی ہے دنیا سے رشتہ منقطع ہونے کے قریب ہوتا ہے۔ تو آخرت ہر شخص پر منکشف ہو جاتی ہے۔ حدیث شریف میں موجود ہے کہ جب آخرت منکشف ہو جاتی ہے تو کفر سے توبہ اس وقت قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایمان بالغیب نہیں رہتا لیکن مسلمان کا توبہ اس وقت بھی قبول ہوتا ہے روح قبض ہونے سے پہلے پہلے۔

یہ مشاہدہ جو صوفیاء کو اللہ اللہ کہنے سے یا قلب کی صفائی سے یا انوارات سے نصیب ہوتا ہے۔ عندالموت سب کو نصیب ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ موت اس قدر شدید کیفیت ہوتی ہے کہ جو باقی ہر طرف سے انسان کی توجہ کو منقطع کر دیتی ہے اور پوری طرح ایک طرف متوجہ ہو جاتا ہے اس لیے اس پر موت کے وقت انکشاف ہو جاتا ہے۔

کافر ہے یا ایسے شخص سے جو زندگی بھر برائی میں مبتلا رہا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں تم کیا کرتے رہے دنیا میں، تمہارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے تمہارے وجود کے ایک ایک ذرے میں ظلمت ہے ان میں کوئی نور ایمان نہیں ہے کوئی اعمال کا نور نہیں ہے تم کیا کرتے رہتے ہو۔ آخر تم نے اتنا عرصہ عمر پائی دنیا میں نیکی کا موقع بھی تھا۔ انسان ہوتے ہوئے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ کبھی تو آدمی کوئی نیکی بھی کرتا ہے، نہ تمہارے اندر عقائد کا نور ہے نہ ایمان کا نور ہے نہ اعمال کا نور ہے۔ تم آخر کرتے کیا رہے ہو۔ وہ لوگ جواب دیتے ہیں۔ ہم غریب لوگ تھے۔ بڑے لوگوں کے پاس تھے جس طرح بڑے لوگ کرتے تھے۔ ہم بھی ایسا کرتے تھے۔ ہم کیا کرتے۔ ہم ان سے علیحدہ ہو کر تو زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ جس طرح امراء کرتے تھے ہم بھی ان کے پیچھے چلتے رہے۔

فرمایا! آج تو تم سب کو چھوڑ کر جا رہے ہو صرف ایک وجود کے سوا۔ کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی۔ آج سے پہلے اللہ کے لیے اس گھر کو چھوڑ دیتے جس میں اللہ کا نام میسر نہیں تھا۔ جس زمین پر نیکی نہیں تھی اسے چھوڑ دیتے۔ تم مجبور تھے ان کے ساتھ رہنے پہ تم کیوں رہتے ہو بڑے لوگوں کے ساتھ جہاں تم تھے اگر وہ ماحول برا تھا وہ معاشرہ برا تھا وہ لوگ برے تھے تو تم چھوڑ دیتے۔ کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی۔ تم اس میں ہجرت کیوں نہیں کر گئے۔ تم برائی کو چھوڑ دیتے۔ جس طرف نیکی کی خوشبو آتی تھی وہاں چلے جاتے۔ آخر آج بھی تو ساری دنیا کو چھوڑ رہے ہو۔ لیکن آج تم مجبوراً چھوڑ رہے ہو۔ تمہیں اپنی پسند سے اللہ کے لیے نیکی کی تلاش میں، اللہ کی تلاش میں۔ اچھائی کے لیے، ایمان کے لیے بروں سے چند قدم دور ہو گئے ہوتے۔ کوئی نیک مجلس تلاش کر لی ہوتی۔

انہوں نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ ساری قوم اگر برائی پہ متفق ہو گئی ہے تو ہم ان کے ساتھ رہیں گے تو ہم کیسے نیک رہیں گے۔

یہ ہماری بات ماننے پر تیار نہیں ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ وہ شخص کسی محفل میں جائے جس سے کسی دوسرے کے متاثر ہونے کی امید ہے کہ کم از کم انہیں تبلیغ کرنے کی استعداد رکھتا ہو۔ اور جس نے جا کر خود اثر قبول کر لینا ہے اس کے لیے کسی بری مجلس میں جانا حرام ہے۔ ہر شخص کی اپنی ایک حالت اپنی ایک خاصیت ہے جس نے جا کر خود اس رنگ میں رنگا جانا ہے۔ اس کے لیے جائز نہیں۔ البتہ اس شخص کے لیے جانا واجب ہو جاتا ہے جس کے جانے سے اس محفل کا رنگ بدل جائے۔ بعض لوگ بعض جگہ پر جاتے ہیں تو اگر ان کو نیک نہ کر سکیں تو وہ ان کے سامنے برائی بھی نہیں کر سکتے۔ کم از کم جتنی دیر وہ لوگ رہتے ہیں برائی رک جاتی ہے۔ ہمارے پاس عوامی لوگ آ جاتے ہیں تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ جی آپ کے پاس آنے والے بعض لوگ اچھے نہیں ہوتے یہ بھی ہوتے ہیں۔ میں نے کہا یہاں تو چوری نہیں کرتے چلو کم از کم دو دن چار دن دس دن جتنے دن یہاں رہتے ہیں وہ دن تو وہ چوری سے بچ کر رہتے ہیں جھوٹ نہیں بولتے چوری نہیں کرتے جھگڑا نہیں کرتے تم کسی کو چند دن بھی نیکی پہ نہیں ٹھہرنے دیتے اگر کسی کے جانے سے بری محفل نیکی کی طرف مائل ہونا شروع ہو جائے یا وہ اس کا اثر قبول کرے تو اس کے لیے جانا واجب ہو جاتا ہے۔

تو بہر حال انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ ہمارا اثر قبول نہیں کر رہے۔ تو ہمیں کم از کم ان سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ اب ہم کیا کریں گے۔ گھر بھی رہ گیا مال اسباب بھی رہ گیا۔ کھانا پینا بھی گیا۔ کچھ بھی نہیں تو انہوں نے کہا غار میں بیٹھ جا جس اللہ کے لیے سب کچھ چھوڑا ہے وہی سب کچھ دے گا اور ہر چیز کا انتظام وہ خود ہی کرے گا۔

اللہ فرماتے ہیں پھر دیکھو جب میرے ہی لیے انہوں نے دنیا کی چیزوں کو چھوڑا تو میں ایسا کریم ہوں۔

کہ دنیا زمین تو زمین رہی انہوں نے دنیا کو چھوڑا تو زمین کے مکان چھوڑے زمین کی دولت چھوڑی، زمین پہ چیزیں چھوڑیں میں نے آسمان پر چلنے والے سورج کو بھی حکم دے دیا کہ تو بھی انہیں پریشان نہیں کر سکتا تو بھی گزرے گا تو ان کا احساس کرتے ہوئے ان میں سے ترچھا ہو کر گزرے گا۔ ان پر سیدھی شعاعیں نہیں ڈالے گا۔ اب بھی فرمایا آج بھی جا کر دیکھ لو سورج طلوع ہوتا ہے تو بھی ان کو غار کو بچا کر اپنا دامن بچا کر اور اپنی شعاعیں سمیٹ کر طلوع ہوتا ہے۔ اور جب غروب ہوتا ہے تو بھی ان کا خیال رکھتے ہوئے اپنا راستہ طے کرتا ہے اور ان پر شعاعیں نہیں پڑنے دیتا۔

ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ اور یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ آج بھی کوئی اس غار پہ کھڑا ہو کر دیکھے تو آج بھی وہ دیکھ سکتا ہے کہ سورج بھی طلوع و غروب ہوتے ہوئے ان کا لحاظ رکھتا ہے کہ وہ پریشان نہ ہوں۔

اخذِ فیضان کے لیے اور انوارات کو جذب کرنے کے لیے خون میں ایک خاص درجہ حرارت کا پایا جانا بھی ضروری ہے اگر وہ نہ ہو تو انوارات آتے بھی ہیں اور چلے بھی جاتے ہیں۔ وجود میں جذب نہیں ہوتے وہاں اپنا ٹھکانا نہیں بناتے وہاں اپنی جگہ نہیں بناتے اور جب تک وہ وجود میں جگہ نہ بنائیں تب تک منازل سلوک کی بنیاد نہیں بنتی۔

(مولانا محمد اکرم مدظلہ)

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

حلقے کے ساتھی عمر شاہ صاحب کی والدہ رضائے الٰہی سے انتقال کر گئی ہیں۔ ان کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

ملک احمد خان صاحب کی والدہ کے لیے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

فرمایا ہدایت اللہ کے پاس ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ انسان اپنے اس تعلق کو جو اس کے دل کا ہے اس کے باطن کا ہے اللہ کے ساتھ درست کرے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اپنے دل میں اللہ کی طلب پیدا کرے، اللہ کے قرب کی طلب پیدا کرے اللہ کی رضا کی طلب پیدا کرے۔ پھر اس سے آگے اس کو سنبھالنا اس کا اہتمام کرنا اس کے لیے دنیا اس کے لیے آخرت اس کیلئے زمین اس کے لیے آسمان ساری چیزوں کو مسخر کرنا فرماتے ہیں یہ میرا کام ہے۔ اسے ولی یا مرشد مہیا کرنا کسی ولی سے اسے فیض کا نصیب ہونا کسی مرشد سے رہنمائی کا نصیب ہونا۔ فرمایا یہ سب کچھ بھی میرا کام ہے۔ اگر میں نہیں چاہتا اگر میرے ساتھ اس کا تعلق درست نہیں ہے تو نہ کوئی ولی اس کے کام آتا ہے نہ کوئی مرشد اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ نہ کوئی اسے فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ نہ کسی سے وہ فیض لے سکتا ہے۔ نہ اس کی کوئی بات سیدھی پڑتی ہے اور اگر میرے ساتھ اس کا معاملہ درست ہو جائے تو سلطنتیں بادشاہتیں حکومتیں مرجع جاتی ہیں۔ زمانے بدل جاتے ہیں مری ذات ابدی ہے دائمی ہے جو میری ذات پہ فنا ہوتے ہیں وہ بھی دوام پا جاتے ہیں۔ ان کی عظمتیں دوام پا جاتی ہیں۔ ان کی برکتیں دوام پا جاتی ہیں۔

آج بھی جا کر اس پر کھڑے ہو جاؤ آج بھی آپ کو سمجھ آجائے گی کہ سورج وہاں سے دامن بچا بچا کر گزرتا ہے تو جہاں آسمان پر چلنے والے سیارے متاثر ہو رہے ہیں زمین کی مخلوق یا زمین کی چیزیں کتنا احترام یا کتنا خیال کرتی ہوں گی۔ بڑی طفیل ہے اس سورۃ میں۔

میرا موضوع تھا کہ اصلاح تصوف میں جو بنیادی سبق ہے رابطہ وہ یہی کیفیت ہے کہ من جانب اللہ طالب کے دل پہ جو انوارات مرتب ہو کر اس کے قلب کو مربوط کر دیتے ہیں، منسلک کر دیتے ہیں تجلیات باری سے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس میں مربوط قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ سب کچھ قربان کر سکتا ہے لیکن اللہ کی رضا کو اللہ کی اطاعت کو اللہ کے ساتھ اپنے تعلقات کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اگر یہ کیفیت حاصل ہو جائے یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر یہ کیفیت حاصل نہ ہو اور ہزاروں تسبیحوں سے بھی حاصل ہو جائیں تو کیا حاصل ہوا۔ چونکہ مقصد تو قرب الٰہی ہے رضائے الٰہی ہے۔ ان کے پاس کہاں انہیں شیخ کی صحبت میں جانے کی فرصت نہیں ملی۔ لیکن یہ ساری چیزیں بیک آن کیسے نصیب ہوگئیں۔ وہ تعلق اللہ سے تھا۔

لیکن یہ یاد رہے کہ انہوں نے مجاہدہ کیا ہے۔

معمولی مجاہدہ نہیں تھا چھ سات آدمیوں کا ایک پوری سلطنت ایک پوری قوم کے سامنے کھڑا ہو جانا اور سب کچھ قربان، حتیٰ کہ جان۔ انہوں نے تو اپنی طرف سے داؤ پہ لگا دی۔ انہوں نے تو کہا کہ قتل بھی ہو جائیں گے تو ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے اگر بچ گئے اللہ نے بچا لیا تو اس کی مرضی۔ لیکن انہوں نے تو سب کچھ داؤ پہ لگا دیا یہ بہت بڑا مجاہدہ تھا۔ جو انہوں نے کیا۔ اللہ فرماتے ہیں جب انہوں نے میرے لیے سب کچھ قربان کر دیا تو میں نے بھی اپنی رحمت کے دروازے کھول دیے۔ انہوں نے چند برتن چھوڑے ہوں مکان چھوڑا ہوگا۔ چند دوست چھوڑے ہوں گے۔ لیکن ہم نے تو زمین تو زمین آسمان تک کی چیزوں کو ان کی خدمت میں لگا دیا انہیں وہ عظمت عطا کی کہ ہمیشہ سب کے لیے اپنی کتاب میں انہیں اپنے کلام میں ان کا تذکرہ ارشاد فرمایا۔ الفاظ کھڑے ہوئے اللہ کی عبادت کے لیے تلاوت ہو رہی ہے۔ نماز پڑھی جا رہی ہے۔ بیت اللہ شریف میں ختم ہو رہا ہے۔ ان کی باتیں ہو رہی ہیں۔ باتیں ان کی ہیں عبادت اللہ کی ہو رہی ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے، کہاں قابل ہوا آدمی کہ اس کا ذکر ہو رہا ہے۔ ذکر انسانوں کا ہے اور عبادت خدا کی ہو رہی ہے۔ چونکہ اللہ نے ان کا ذکر کیا اس لئے اس ذکر کو دہرانا اللہ کے کلام کو دہرانا ہے۔

تو فرمایا۔ انہوں نے جو کچھ چھوڑا وہ کچھ بھی نہیں تھا ہم نے انہیں جو کچھ دیا وہ بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن بنیادی طور پہ انہوں نے کچھ چھوڑا بھی نہیں۔ میں نے انہیں بہت دیا ہے اور اگر وہ میرے لیے نہ چھوڑتے میرے دروازے پہ نہ آتے تو پھر انہیں کوئی بھی کچھ نہیں دے سکتا تھا۔

یادیں اُن کی

میجر غلام محمد
وان بھچراں۔ میانوالی

یہ فروری ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ میں رسالپور میں تھا۔ کچھ دنوں کے بعد محمد احسن بیگ کی رسالپور آمد ہوئی۔ تو بہت باتیں سننے کو ملیں۔ چند احباب کے علاوہ سب احسن بیگ سے متنفر تھے میری جو ایک دو ملاقاتیں ان سے ہوئیں ان میں انہوں نے اپنے استاد المکرم حضرت مولانا اللہ یار خان کا تذکرہ کیا۔ حضرت جی کا شمار پاکستان کے چوٹی کے علماء میں تھا۔ وہ اہل تشیع کے خلاف بلند پایہ مناظر تھے۔ ان کے جلسوں اور تقریروں کے بڑے بڑے پوسٹر دیواروں پر دیکھ چکا تھا مگر تاحال ملاقات نہیں ہوئی تھی ایک دن میں احسن بیگ کے پاس پینٹ لینے گیا۔ میری یونٹ کی سالانہ ٹیکنیکل انسپکشن تھی۔ اور رسالپور میں ان کے بغیر اور کسی کے پاس پینٹ نہ تھا۔ احسن بیگ نے مجھے اگلے روز پینٹ دینے کا وعدہ کیا اور ساتھ ہی بتایا کہ حضرت مولانا اللہ یار خان صاحب ان کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ رات کو محفل ذکر ہوگی۔ شمولیت کے لیے ضرور آنا۔ میرا تعلق خانقاہ سراجیہ کندیاں سے تھا اور تقریباً گیارہ سال سے حضرت مولانا خان محمد سے منسلک تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا جاؤں یا نہ جاؤں۔ شام کلب میں فلم دیکھنے کا پروگرام بھی تھا۔ چنانچہ شام سے پہلے ہی دو تین کاریں میرے گھر پہنچ گئیں تاکہ مجھے اپنے ساتھ کلب میں لے جائیں۔ میں سخت تذبذب میں تھا اگر احسن بیگ کے گھر نہیں جاتا تو وہ ناراض ہو کر پینٹ دینے سے انکار کر سکتا تھا۔ اس طرح میری ٹیکنیکل انسپکشن کا بیڑہ غرق ہو سکتا تھا۔ لہذا میں نے پینٹ کو مدنظر رکھ کر کلب جانے سے انکار کر دیا۔ اور شلوار قمیض پہن کر احسن بیگ کے گھر چلا گیا۔ جیسے ہی میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا حضرت المکرم وضو فرما کر باہر نکلے تھے۔ احسن بیگ نے میرا تعارف کرایا۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے مگر حضرت المکرم میرا ہاتھ نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئے اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ شاید میں اس قابل بھی نہیں کہ مجھ سے کوئی اہل اللہ مصافحہ کرے۔

میں ان کے پیچھے چل پڑا۔ سڑک عبور کر کے حضرت جی کنٹونمنٹ بورڈ کی ایک چھوٹی سی مسجد میں نماز پڑھانے تشریف لے گئے۔ میں بھی وضو کر کے جماعت میں شریک ہو گیا جیسے ہی حضرت جی نے قرات شروع کی مجھ پر عجیب رقت طاری ہو گئی اور نماز کے دوران بے ساختہ روتا رہا۔

نماز اور نوافل سے فارغ ہو کر سب لوگ احسن بیگ کے گھر جمع ہو گئے تو میں بھی باقی افسروں (جن میں کیپٹن (بریگیڈیئر) محمد حنیف، کیپٹن (میجر) عمر حیات، کیپٹن زین العابدین، فلائیٹ لیفٹیننٹ ہادی حسین شاہ موجود تھے) کے ساتھ اگلی قطار میں بیٹھ گیا۔ ایک لمبا سا آدمی کھڑا ہو گیا اور بتانے لگا کہ ہمارا سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ ہے۔ ہم پاس انفاس سے ذکر کرتے ہیں۔ ذکر کرتے وقت قبلہ رُخ قطاروں میں شیخ کے بائیں بیٹھ کر آنکھیں اور منہ بند رکھ کر اندھیرے میں وصول الی اللہ کے لیے لطائف پر اللہ ھُو کی ضربیں لگاتے ہیں۔ ہمیں روحانی فیض شیخ کے توسط سے براہ راست محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اویسی طریقہ پر ملتا ہے۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو میرے بارے میں حضرت جی سے پوچھا کہ کیا یہ محفل ذکر میں بیٹھا رہے

حضرت جی نے فرمایا کہ اس علاقے کی مٹی میں اخذ فیض کی صلاحیت نہیں انہوں نے اپنے بڑوں سے اولیاء اللہ کی مخالفت ہی سیکھی ہے۔ یہ کیا ذکر کرے گا۔ اس پر اس لمبے آدمی نے سختی کے ساتھ مجھے حکم دیا کہ میں یہاں سے اٹھ جاؤں۔ میں وہاں سے اٹھ تو گیا مگر شاید مجھ میں اس قدر ذلیل و خوار ہو کر نکلنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں سب سے پیچھے جوتیوں میں بیٹھ گیا۔ اس دوران لائٹ بند ہو گئی تھی۔ اور حضرت جی نے سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَر وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم۔ اللّٰہ اللّٰہ اللّٰہ ھُو۔ چلو پہلا لطیفہ قلب کہہ کر ذکر شروع کرایا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے کمرے میں روشنی ہو۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو واقعی کمرے میں روشنی تھی۔ میں نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر کے بعد میں نے بہت زیادہ روشنی کی موجودگی میں جب آنکھیں کھول کے دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ انوارات تجلیات کی شکل میں حضرت جیؒ کے سینہ مبارک سے نکل کر دیگر احباب کی طرف لپک رہے تھے۔ اور انہی انوارات نے تمام کمرے کو بے حد منور کیا ہوا تھا۔ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ یا اللہ یہ کیا شخص ہے۔ ایسے آدمی تو کتابوں میں پڑھے تھے۔ اس دور میں کیسے پیدا ہو گئے جب ذکر ختم ہوا تو میں پوری طرح حضرت جیؒ کی روحانی عظمت کا قائل ہو گیا تھا اور فیصلہ کر چکا تھا کہ ایسے شخص کا دامن ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے وہ مجھے اپنے قابل سمجھتا ہے یا نہیں۔ جیسے ہی لائٹ آن ہوئی میں اٹھا اور جا کر حضرت جیؒ کے پاؤں پر گر گیا۔ میں بے اختیار گڑگڑا کر رو تا رہا جب رو رو کر میرے دل کا غبار ہلکا ہو گیا تو حضرت جیؒ نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا کہ بیٹا احساس زیاں آدمی کے پاس بڑی متاع ہے آدمی کو گناہ کا احساس جب بھی ہو جائے تو وہ واپس آ سکتا ہے۔ اور اگر احساس ہی مر جائے تو پھر یہ زندگی بے کار ہے زندگی کا جو وقت باقی رہ گیا ہے۔ اس کو اللہ کی یاد میں صرف کرو۔ اہل اللہ میں شامل ہو جاؤ۔ نماز کی پابندی کرو۔ حرام سے فرق کو پہچانو۔ پھر بڑی دیر تک مجلس میں دین کی باتیں ہوتی رہیں میں جب رات کو دیر سے گھر پہنچا تو بہت بھوک لگی ہوئی تھی۔ کھانا مانگا تو بیوی نے کہا کہ جن کے پاس گئے تھے۔ کھانا بھی انہی سے مانگو۔ چنانچہ اس رات کو بھوکا ہی سونا پڑا۔ اگلے دو دن گھر بلوانا چاہتی کی وجہ سے حضرت جیؒ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکا۔ نیسرت دن حضرت جیؒ تانگے میں بیٹھ کر ایئر فورس کے ایک ساتھی سارجنٹ محمد اشرف کے گھر تشریف لے جا رہے تھے۔ میں اپنے لان میں بیٹھا پھول کی کیاریوں کی گوڈی کر رہا تھا کہ مجھے احسن بیگ نے کہا کہ حضرت جیؒ کے پیچھے پیچھے آجاؤ میں سائیکل پکڑ کر حضرت جیؒ کے پیچھے پیچھے سارجنٹ محمد اشرف کے گھر پہنچ گیا۔ یہ میرا حضرت جیؒ کے ساتھ دوسرا ذکر تھا۔

اوپر سلسلے سے منسلک ہونے کے بعد میرے دونوں بڑے بھائی بھی میرے ساتھ شامل ہو گئے میرے چچا حکیم محمد حسین کے تین بیٹے، میرے سسرال اور خاندان کے دوسرے چند افراد کے سلسلہ میں آجانے کے بعد واں بھچراں میں جماعت کی صورت پیدا ہو گئی۔ چچا محمد حسین جب بھی ملتے مجھے لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ پڑھنے کی ہدایت کرتے۔ انہیں یقین تھا کہ میں کسی شیطانی چکر میں پڑ گیا ہوں۔ ایک سال تک انہوں نے ہمیں بغور دیکھا۔ ایک دن وہ مجھے کہنے لگے کہ سمجھ میں نہیں آتا تم لوگ صبح ہو باغلط مگر میں نے دیکھا ہے کہ حضرت مولانا اللہ یار خان کے ساتھ لگ کر میرے بیٹے نیک ہو گئے ہیں۔ پہلے تو ان کو نماز کی توفیق بھی نہیں ہوتی تھی۔ اب انہوں نے داڑھیاں رکھ لی ہیں۔ بُرے کام چھوڑ دیے ہیں۔ اور تہجد گذار ہو گئے ہیں۔ کہنے لگے مجھے بھی تم لطائف کراؤ۔ میں نے دو تین دن ان کو لطائف کرائے اس کے کچھ دنوں بعد مفتی غلام صمدانی واں بھچراں آئے اور حکیم چچا کو مسجد نک منازل کرا گئے۔ میرے بڑے بھائی غلام حسین نے مجھے لکھا کہ غضب ہو گیا۔ چچا تو ابھی متذبذب تھے۔ اور مفتی غلام صمدانی ان کو مسجد نک منازل کرا گئے ہیں۔ میں نے ان کو لکھا کہ ان کے کرائے ہوئے منازل میں شک مت کرو۔ تم ان کا مسجد نک خیال رکھا کرو۔ حضرت جیؒ نے چچا حکیم کو لکھا کہ وہ منارہ کے دورہ پر ضرور آئیں۔ وہ حضرت جیؒ کے حکم کے مطابق باول نخواستہ منارہ تو چلے گئے۔ مگر سوچتے یہی رہتے تھے کہ معلوم نہیں ان کو منازل بھی ہوئے ہیں یا نہیں۔ ایک دن مولوی محمد سلیمان جماعت کو سمول کرا رہے تھے۔ یہ جب سیر کعبہ پر پہنچے تو ان پر رقت طاری ہو گئی۔ روتے رہے اور غلاف کعبہ کو پکڑ کر دعا کرتے رہے۔ جماعت تو مسجد نبوی تک پہنچ چکی تھی۔ مولوی محمد سلیمان نے مفتی غلام صمدانی سے پوچھا کہ کیا تم نے کبھی مقبول دعا دیکھی ہے اگر دیکھنا ہے تو حکیم محمد حسین کی طرف دیکھو جو ابھی تک غلاف کعبہ کو پکڑ کر رو رو کر دعا کر رہے تھے اور ان کی دعا عرش

معلی سے گزار رہی تھی۔ چچا نے مجھے بتایا کہ جب میں نے اپنی حالت کے متعلق مولوی محمد سلیمان کی زبانی سنا تو حیران رہ گیا کہ ان کو کیسے پتہ چل گیا۔ حالانکہ ساری جماعت تو مسجد میں پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد چچا کا دل بھی مطمئن ہو گیا۔ اور وہ مکمل یقین کے ساتھ حضرت جیؒ کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔

میں خود شروع شروع میں کبھی حضرت جیؒ کی روحانی قوت کے متعلق سوچ میں پڑ جاتا تھا۔ اس بارے میں میں نے سابقہ شیخ حضرت مولانا خان محمد (سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ کندیاں) کی خدمت میں خط ارسال کیا۔ جس میں دلائل السلوک کے چند اقتباسات اور حضرت جیؒ کے کچھ حالات و واقعات جو میری نظر سے گزر چکے تھے۔ ان کی خدمت میں لکھے۔ انہوں نے جواب میں مجھے لکھا کہ:۔

"عزیزم! مولانا اللہ یار خان سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے شیخ ہیں ان کے متعلق کوئی اویسیہ سلسلے کا آدمی ہی کلام کر سکتا ہے تم بہر حال ہمارے بتائے ہوئے وظائف باقاعدگی سے کرتے رہو"۔

اپریل ۱۹۷۰ء کے آواخر میں حضرت جیؒ کے ساتھ شریک سفر ہوا۔ یہ سفر میں نے راولپنڈی سے کراچی تک کیا۔ محمد یوسف اور بشیر حضرت جیؒ کے ساتھ رہے تھے۔ خدمت کی ڈیوٹی میرے ذمہ تھی۔

عصر کی نماز کے لیے وضو کرنے کی غرض سے حضرت جیؒ گاڑی کی لیٹرین میں گئے تو میں یوسف صاحب کے پاس آ بیٹھا اور ان سے پوچھا کہ میرے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ آپ مجھے ان کے برزخ کے حالات سے آگاہ کریں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ماں تو نجات میں ہے مگر باپ گرفت میں ہے۔ مجھے یقین نہیں آیا کیونکہ والد صاحب بہت ہی نیک شخص تھے۔ پھر میں اٹھ کر لیٹرین کی طرف چلا گیا۔ حضرت جی جب باہر نکلے تو مجھے بتایا کہ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے شیطان لعین نے پیچھے سے گندا گوشت کا ٹکڑا ان پر پھینک دیا۔ جس سے قمیض ناپاک ہو گئی۔ دھونے کی کوشش تو بہت کی ہے مگر داغ نہیں گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر جب حضرت جیؒ واپس اپنی سیٹ پر آ بیٹھے تو میں نے اپنے والدین کی برزخی حالت کے متعلق سوال کیا۔ حضرت جیؒ کھڑکی سے باہر تھوڑی دیر کے لیے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔ پھر فرمانے لگے کہ ماں تو ٹھیک ہے مگر والد عذاب میں ہے۔ اب میرے لیے مان لینے سے چارہ نہیں تھا۔ محمد یوسف نے حضرت جیؒ سے درخواست کی کہ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ ان کے والد کا عذاب دور فرمائے۔ حضرت جیؒ نے دعا فرمائی اور میرے والد کا قبر کا عذاب ختم ہو گیا۔

اس کی تصدیق کچھ دنوں بعد رسالپور میں کیپٹن زین العابدین نے کی۔ وہ میرے گھر میں بیٹھے تھے میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ میرے والد کی برزخی حالت کے متعلق مجھے بتائے۔ وہ کشف کی باتیں بتانے سے اکثر احتراز کرتے تھے۔ بڑی مشکل سے ان کو راضی کیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ چونکہ میرے والد کی قبر سے واقف نہیں تھے لہذا میں ان کی رہنمائی کروں۔ چنانچہ میں نے ان کو کہا کہ چلو میرے والد کی قبر پر۔ میں اس کا امتحان لینے کے لیے گھنڈی (کندیاں) کے قبرستان میں ایک قبر پر خیال کر کے بیٹھ گیا۔ اس نے جب صاحب قبر کو دیکھا تو آنکھیں کھول دیں کہ صاحب قبر تو کہتا ہے کہ میں اس کا والد نہیں۔ میں نے اس کا حلیہ پوچھا تو انہوں نے صحیح بتایا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ دیکھو اس قبرستان میں کوئی پانچ لطائف والا آدمی ہے تو اس نے مجھے بتایا کہ ہاں ایک معمر بزرگ ہے جس کے پانچ لطائف ہیں۔ (یہ مولانا احمد خانؒ خانقاہ سراجیہ کندیاں کا مرید تھا) میں نے کہا کہ اس سے پوچھو کیا یہ مجھے جانتا ہے۔ اس کے جواب میں اس بزرگ نے میری بغل پر ہاتھ لگایا۔

زین العابدین کہنے لگے۔ مجھے سمجھ نہیں آئی کہ یہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سات سال کا تھا کہ مجھے میری اماں اس بزرگ کے پاس دم کرانے لے آئی تھی۔ اس نے کچھ پڑھ کر میری بغل میں ہاتھ پھیرا تھا۔ اس کے بعد وہ فوت ہو گیا۔ یہی اس کی مجھ سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ اس واقعہ سے حضرت جیؒ کی یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ صاحب قبر کی کسی کے ساتھ ایک ملاقات بھی ہوئی ہو تو وہ اس کو یاد رکھتا ہے۔ پھر میں نے زین العابدین سے پوچھا کہ کیا کوئی قلب والے بھی ادھر ہیں تو وہ کہنے لگے کہ سات شخص ایک قطار میں کھڑے ہو گئے ہیں۔ آخری آدمی نے اپنا منہ ڈھانپا ہوا ہے۔ میں نے اس کو بتایا کہ یہ علاقہ کا قریشی خاندان ہے۔ اس آخری آدمی کو میں جانتا ہوں۔ یہ گھنڈ والا مولوی مشہور تھا۔ مسجد کے علاوہ کسی جگہ اپنا گھنڈ نہیں کھولتا تھا اور میں بچپن میں اس کے پیچھے نماز پڑھ چکا ہوں۔ اس کے بعد میں اس کو اپنے والد کی قبر (... دان بھچراں) پر لے گیا۔ وہ مجھے کہنے لگا کہ یہاں تو تمہاری ماں کی قبر بھی ہے۔ میں نے پوچھا

کو تمھیں کیسے معلوم ہو گیا۔ وہ کہنے لگا کہ میں نے آپ کے ماں باپ کو ایک ساتھ دیکھا ہے تو تمھارے والد نے مجھے بتایا کہ یہ غلام نمر کی ماں ہے۔ میں حیران ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے کیسا زبردست کشفِ قبور اس شخص کو عطا کیا ہے۔ سینکڑوں میل دور بیٹھ کر سب کچھ صحیح بتا رہا ہے۔ پھر میں زین العابدین کو مولانا حسین علیؒ کی قبر پہ لے آیا اور ان سے پوچھا کہ حضرت آپ کیسے شاگرد اور مجھے جانشین پیچھے چھوڑ آئے ہیں؟ زین العابدین نے مجھے بتایا کہ مولانا حسین علیؒ نے اس سوال پر گردن جھکائی ہے۔ پھر میں زین العابدین کو خانقاہ سراجیہ حضرت مولانا احمد خانؒ کے پاس لے گیا زین العابدین نے مجھے بتایا کہ یہ شخص فنافی الرسول ہے۔ مولانا عبداللہ کے منازل ان سے نیچے ہیں۔ مولانا عبداللہ نے زین العابدین کو کہا کہ اپنے شیخ المکرم کو کہو کہ ہمارے جانشین خان محمد کو بھی سلوک طے کرائیں۔

اکتوبر ۱۹۷۰ء میں حضرت جیؒ میرے ہاں رسالپور تشریف لائے آتے وقت راستے میں زین العابدین کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ جس میں حضرت جی زخمی ہو گئے۔ اسی وجہ سے دس کی بجائے سولہ روز قیام فرمایا۔ وضو نہیں فرما سکتے تھے۔ تیمم کرتے رہے۔ جن اینٹوں سے تیمم فرماتے وہ میرے پاس محفوظ ہیں۔ (اور میں نے وصیت کی ہے کہ یہ اینٹیں میری قبر میں لگائی جائیں) اس قیام کے دوران ایک روز مفتی غلام صمدانی بشیر کے ساتھ رسالپور سے نوشہرہ گئے۔ جب واپس آئے تو بشیر نے حضرت جیؒ سے درخواست کی کہ دوران سفر مفتی غلام صمدانی نے اس زور سے چیخ ماری کہ سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اب بتاتے نہیں کہ بات کیا ہے۔ حضرت جیؒ نے مفتی غلام صمدانی سے کہا کہ آپ ان کو تمام واقعہ بتا دیں۔ مفتی غلام صمدانی نے بتایا کہ جب وہ بس میں سوار ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ بس میں سب سے آگے جو گول گول قسم کی چیز ہوتی ہے جس کے پیچھے ڈرائیور بیٹھتا ہے اس کے ساتھ ایک بندر چپٹا ہوا ہے۔ کبھی اس کو دائیں گھماتا ہے اور کبھی بائیں۔ ڈرائیور کی یہ روحانی شکل دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔ حضرت جیؒ کی اس مجلس میں پروفیسر محمد اسلم بھی موجود تھے۔ پروفیسر محمد اسلم کورنگ آف انجینئرز کے مانے ہوئے ریاضی کے استاد تھے۔ اور ان کی THIRD DIMENSION تھیوری بہت مشہور تھی جس سے وہ اللہ کی ہستی اور فرشتوں کے وجود کو ثابت کیا کرتے تھے انہوں نے حضرت جیؒ سے سوال کیا کہ کیا یہ سچ ہے کہ نیل آرمسٹرانگ چاند پر پہنچ گیا ہے؟ حضرت جیؒ نے فرمایا کہ چلو اسی آدمی سے پوچھ لیتے ہیں۔ جو سٹیرنگ کو گول گول گھماتا ہے۔ پھر حضرت جیؒ نے مفتی غلام صمدانی سے کہا کہ وہ ان کے قلب پر خیال کرے۔ اور انوار جس جگہ جا رہے ہیں اس جگہ کی تفصیل بتانا شروع کر دے۔ مفتی غلام صمدانی نے نیل آرمسٹرانگ کا پورا سفر اور وہ جگہ جہاں وہ پہنچے تھے پوری تفصیل سے دیکھ کر بتائے۔ پروفیسر محمد اسلم حیران تھے کہ ایک کم تعلیم یافتہ آدمی ایسی ایسی تفصیلات بتا رہا تھا جو ہلا بانے خود بھی واپس آ کر بیان نہیں کی تھیں۔ حضرت جیؒ نے مفتی غلام صمدانی سے کہا کہ اب دیکھو چاند اس جگہ سے جہاں نیل آرمسٹرانگ پہنچا ہے۔ کتنا دور ہے۔ مفتی صمدانی نے بتایا کہ چاند اتنا دور ہے جتنا یہاں سے نیچے زمین نظر آتی ہے۔ حضرت جیؒ نے فرمایا کہ چاند اس سے بھی دور ہے۔ پھر پروفیسر محمد اسلم نے پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے جدھر نیل آرمسٹرانگ پہنچا ہے حضرت جیؒ نے فرمایا کہ بہتر جانتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ کوئی قطعہ ارض ہو جہاں سے قوموں پر عذاب نازل ہوتے رہے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد پروفیسر محمد اسلم حضرت جیؒ کا اتنا گرویدہ ہوا کہ وہ ہم سب کو اپنے گھر لے گیا اور اپنے سب بچوں کو حضرت جیؒ کی خدمت میں لے آیا۔ کہ آپ ان کو بیعت کریں حضرت جیؒ نے ان کو بتایا کہ میں روایتی پیر نہیں ہوں۔ میں ایک روحانی معلم ہوں۔ ظاہری بیعت پر یقین نہیں رکھتا۔ اپنے شاگردوں کی روحانی تربیت کر کے دربارِ نبوی میں روحانی بیعت کے لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر بیعت کراتا ہوں پھر جب چائے آئی تو اس کے ساتھ کھانے کی کچھ چیزیں بھی تھیں حضرت جیؒ نے صرف ایک چیز کھائی اور فرمایا کہ باقی بازار سے لائی گئی ہیں لہٰذا میں نہیں کھاتا۔ پروفیسر محمد اسلم نے عرض کی کہ یہ چیز میری بیٹی نے بنائی ہے جو پابند صلوٰۃ ہے۔ باقی چیزیں واقعی بازار سے منگائی گئی ہیں۔

رسالپور میں حضرت جیؒ کے اسی قیام کے دوران ایک عجیب بات واضح ہوئی۔ ایک روز میں مولوی محمد سلیمان کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ وضو کر رہے تھے گھر کی پچھلی جانب آٹھ سرونٹ کوارٹر تھے۔ ان میں سے دو کوارٹر میں نے ایک غریب تانگے والے بوڑھے کو جوان کو دے رکھے تھے۔ اس کی بیوی اور بیٹی میرے گھر میں کام کرتی

تھیں۔ مولوی محمد سلیمان کی نظر جب غیر آباد کوارٹروں پر پڑی تو کہنے لگے "دُر دُر۔ یہ کیا بلائیں پال رکھی ہیں" کہنے لگے کہ ایک جن کھڑکی میں سے سر نکال کر ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر یہ بھاگ کر کوچوان کی گھوڑی میں گھس گیا۔ وہ لیٹ گئی۔ میرا بیٹا یمین محمد ذاکر ہمارے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ کہنے لگا جب سے حضرت جیؒ یہاں تشریف لائے ہیں، کوارٹرز میں موجود تمام افراد اور گھوڑی گرفت میں ہیں۔ مولوی محمد سلیمان نے ہمیں بتایا کہ حضرت جیؒ کے قلب کے انوارات پورے محلے کو منور کر دیتے ہیں۔ زمین، مکانات، درخت وغیرہ سب بے حد منور ہو جاتے ہیں۔ جہاں جنات کے لیے رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ جاندار اشیاء یعنی انسانوں اور حیوانوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے جنات نے آپ کے کوارٹروں کے بے دین افراد اور گھوڑی میں پناہ لے رکھی ہے۔ پھر جیسے ہی حضرت جی میرے گھر سے تشریف لے گئے وہ سب تندرست ہو گئے۔

حضرت جیؒ جب پہلی بار حج کے لیے تشریف لے گئے تو

میں بھی کراچی تک ساتھ گیا۔ جب حضرت جیؒ حج کر کے واپس لوٹے تو تمام اکابر ساتھی کراچی میں موجود تھے۔ ائیرپورٹ سے جب حضرت جیؒ باہر آئے تو آپ کے بدن پر رنگدار کھدر کے کپڑے تھے۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اگر حضرت جیؒ یہ خلعت مجھے عطا کریں گے تو میرا کام بن جائے گا۔ مسجد مکو والی کے قریب نیوی کوارٹرز میں حضرت جی کا قیام تھا۔ تمام اکابر ساتھیوں نے ان کپڑوں کی خواہش حضرت جیؒ کے سامنے ظاہر کی مگر وہ خاموش رہے۔ رومال بھی بدل لیا۔ تسبیح بھی دے دی مگر کپڑے کسی کو نہیں دیے۔ مجھے اپنی خواہش ظاہر کرنے کی ہمت ہی نہیں پڑی کیونکہ میں بالکل نکتدی تھا۔ واپسی پر چکوال کے ساتھیوں نے حضرت جیؒ کے کپڑے غائب کر دیے کہ کہیں حضرت جی اپنے یہ کپڑے بدل کر کسی اور کو نہ دے دیں۔ جب جہلم کے ریلوے سٹیشن پر اُترے تو حافظ غلام قادری نے ایک قریبی مسجد میں عارضی قیام و طعام کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ سامان وغیرہ رکھ کر جب ساتھی باہر نکلے تو مسجد میں صرف حضرت جیؒ اور میں رہ گئے۔ حضرت جیؒ نے مجھے فرمایا کہ کوئی دھوتی لے آؤ۔ میں کسی ساتھی کی دھوتی اُٹھا کر لے آیا اور حضرت جی کو دے دی۔ حضرت جی نے دھوتی باندھ لی اور شلوار قمیض اتار کر مجھے دے دی اور فرمایا کہ ان کی خواہش سب سے پہلے ائیرپورٹ پر تم نے کی تھی۔ لہٰذا یہ میں تمہیں دیتا ہوں۔ ساتھی جب تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو دیکھا کہ حضرت جیؒ صرف دھوتی باندھ کر تشریف فرما ہیں۔ فوراً کہیں سے نکال کر حضرت جی کے کپڑے لے آئے۔ (حضرت جیؒ کے کپڑے میرے پاس محفوظ ہیں اور مجھے اپنے شیخ المکرم کی عطا اور کشفِ قلوب کی یاد دلاتے رہتے ہیں)۔

سلامت پورہ گلی نمبر ۱ مکان نمبر ۲ مولانا فضل حسین کے گھر کا پتہ تھا۔ مولانا فضل حسین کے پاس حضرت مولانا فضل علی قریشیؒ کا خرقہ تھا۔ مولانا فضل علی قریشیؒ، مولانا حسین علیؒ (واں بھچراں) اور مولانا احمد خانؒ (خانقاہ سراجیہ کندیاں کے بانی شیخ المکرم) کو ایک ساتھ خرقہ ملا تھا۔ ان تینوں اصحاب کا تعلق نقشبندیہ مجددیہ سلسلے سے تھا۔ مولانا فضل حسین لاہور کے مستند پیر تھے ان کے مریدین کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ نہایت خوشحال تھے۔ گاڑی تھی، بنگلہ تھا۔ ٹرانسپورٹ چلتی تھی۔ مولانا فضل حسین نے حضرت جی کو خط لکھا کہ ان کے شیخ نے ان کو حقیقت صلوٰۃ تک منازل کرائے تھے۔ اب وہ حیات نہیں لہٰذا مزید سلوک طے کرنے کے لیے آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں۔ حضرت جیؒ نے ان کو لکھا کہ وہ کراچی جانے کے لیے لاہور آئیں گے تو آپ مجھے مل لیں۔ مولانا فضل حسین اپنے تمام مریدین کے ساتھ لاہور ریلوے سٹیشن پر پہنچے اور حضرت جیؒ کو اپنے گھر سلامت پورہ لے گئے۔ حضرت کے ساتھ گفتگو کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ انہوں نے تو مخلوق کو اب تک دھوکے میں رکھا۔ ان کی تو روحانی بیعت ہی نہیں لہٰذا انہوں نے برسرِ عام اعلان کیا کہ اب تک وہ خود کامل صوفی نہیں تھے اور جو لوگ ان کے ساتھ رہے وہ بھی دھوکے میں رہے۔ لہٰذا آج کے بعد حضرت مولانا اللہ یار خان ان کے پیر و مرشد ہیں جس کا جی چاہے ہمارے ساتھ رہے جس کا جی چاہے چھوڑ کر چلا جائے۔ یہ اعلان سننے کے بعد مریدین کی اکثریت چھوڑ کر چلی گئی۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران میں واہگہ سیکٹر میں تعینات تھا۔ ہر ہفتے باقاعدہ مولانا فضل حسین کے پاس ذکر کے لیے حاضری دیتا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب جنگ ۱۹۷۱ء کے فوراً بعد حاضر ہوا تو شام کو مولانا فضل حسین سائیکل پر گھر واپس آئے۔ مغرب کے بعد ذکر کرایا اور عشاء کے بعد کچھ دیر بات چیت کرنے کے بعد لیٹ گئے کھانے وغیرہ کا کچھ نہیں پوچھا۔ علی الصبح اُٹھ کر نوافل کے بعد ذکر کرایا اور فجر کی نماز سے جب فارغ ہوئے تو مجھے کہنے لگے کہ افسوس ہے کہ میں آپ لوگوں کی کچھ خدمت نہیں کر سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ گھر میں دو دن سے فاقہ ہے اور کھانے کو کچھ نہیں۔ پھر انہوں نے

سارا واقعہ اویسیہ سلسلے میں آنے کا اور یہاں تک ان کی حالت پہنچنے کا مجھے سنایا۔ اب ان کی حالت یہ تھی کہ ایک ورکشاپ میں جو سلامت پورہ سے تیرہ میل دور تھی ملازمت کرتے تھے۔ سائیکل پر تیرہ میل جاتے اور سائیکل پر واپس آتے۔ یہ حالت سن کر میں حیران رہ گیا۔ میں سیدھا یونٹ پہنچا۔ گاڑی میں خورد ونوش کی چیزیں رکھوائیں اور واپس سلامت پورہ آ گیا۔ مجھے دیکھ کر مولانا فضل حسین خوش نہیں ہوئے۔ کہنے لگے میں نے اپنے حالات آپ کو اس لیے تو نہیں بتلائے تھے۔ میں نے کہا کہ حضرت اس دفعہ قبول کر لیں آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ اس کے بعد جب میں نے مولانا فضل حسین کے یہ حالات حضرت جیؒ کو بتائے تو وہ فرمانے لگے کہ ایسا مخلص شخص پیروں میں میں نہیں دیکھا۔ اس شخص نے اپنا سب کچھ مجھ پر قربان کر دیا۔ پھر مارچ ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر ریاض کے ہاں گلبرگ

میں حضرت جی کا قیام تھا۔ مولانا فضل حسین آکر ملے تو حضرت جی نے خیر خیریت دریافت کی تو مولانا فضل حسین رو پڑے۔ کہنے لگے اور تو کسی چیز کے جانے کا دکھ نہیں مگر ڈر لگتا ہے کہ کہیں آپ کا تعلق ہاتھ سے نہ جاتا رہے۔ حضرت جی نے تسلی دی کہ حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ جس کی جتنی ہمت ہوتی ہے اسی قدر اس پر اللہ تعالیٰ بوجھ ڈالتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے دن بدلے وہ ابوظبی چلے گئے۔ بچوں کو بھی وہیں بلا لیا۔ جب آخری دنوں میں بیمار پڑے تو کمپنی نے پیش کش کی ان کا علاج جس ملک سے وہ چاہیں کرایا جا سکتا ہے۔ مولانا فضل حسین نے پاکستان آنے کو ترجیح دی۔ اور اپنے شیخ المکرم کے قدموں میں اپنی جان اللہ کے سپرد کر دی۔

۲۹ دسمبر ۱۹۷۲ء کو عشاء کے بعد مولانا شمس الحق افغانی کے پاس بہاولپور میں ان کی رہائش گاہ پر حاضر ہوا۔ میں وردی میں تھا۔ چولستان سے ڈیڑھ سو میل کا سفر کر کے ان کے پاس حاضر ہوا تھا پہلے تو انہوں نے دیکھا تو کہنے لگے کہ جنرل اقبال کا گھر ساتھ والا ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت میں ان کو نہیں آپ کو ملنے آیا ہوں۔ انہوں نے مجھے بٹھایا اور وجہ پوچھی۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کی کہ میں تو ان کی خدمت میں سلوک سیکھنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں، چاروں سلاسل کے مشائخ کی کتابیں میں پڑھ چکا ہوں، منازل سلوک کا مطالعہ کیا ہے، راہ سلوک پر چلانے والے کی تلاش میں سرگردان پھر رہا ہوں۔ آپ کے پاس بڑی امید لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ حضرت

ضرور میری رہنمائی فرمائیں۔ مولانا افغانی نے کچھ دیر کے توقف کے بعد فرمایا کہ آپ چالیس دن مسلسل دو ہزار مرتبہ استغفار، دو ہزار مرتبہ درود شریف اور تین ہزار مرتبہ نفی اثبات کا وظیفہ کریں۔ اگر کسی دن ناغہ ہو جائے تو اس کے بعد سے چالیس دن کا شمار کریں۔ چالیس دن کے بعد مجھے بذریعہ خط یا خود حاضر ہو کر قلبی کیفیت بیان کریں، اگلا سبق اس کے بعد شروع ہوگا۔ میں نے واپس آکر حضرت کو سارا واقعہ بتایا۔ حضرت جی فرمانے لگے کہ انہوں نے آپ کو ٹالا ہے۔ یہ وظائف تو انہوں نے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے بتائے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر روز یہ وظیفہ کرنے کے لیے پانچ گھنٹے چاہئیں۔ اور وردی والے آدمی کو پانچ گھنٹے فرصت کب مل سکتی ہے تم ایک دن وظیفہ کرو گے دو دن کرو گے۔ پھر ناغہ ہو جائے گا۔ پھر سوچنے لگو گے کہ یہ معمولی سا عام وظیفہ میں نہیں کر سکا۔ شرمندگی کی وجہ سے اول تو ان کے پاس جاؤ گے نہیں اور چلے بھی گئے تو دوبارہ سلوک کا نام نہیں لو گے۔ ان کی شخصیت بھی قائم رہے گی۔ اور سلوک بھی سکھانا نہیں پڑے۔ کس کے پاس وظائف کے لیے وقت ہے اسی لیے جو آتا ہے ہم تو لطائف سے ہی شروع کرا دیتے ہیں۔ اگر استعداد ہوئی تو چل پڑے گا نہیں تو خود بخود چھوڑ جائے گا۔

میرا ایک دوست بچپن سے نیکوکار آدمی تھا۔ اس نے جنرل اکرم کی لکھی ہوئی کتاب "سیف اللہ" (SWORD OF ALLAH) پڑھی۔ اس کے بعد وہ زنا کی طرف راغب ہو گیا۔ میں حضرت جی کے ساتھ کراچی میں تھا تو میں نے یہ کتاب بازار سے خریدی۔ میں اس الجھن میں تھا کہ مصنف نے اس موضوع کا انتخاب کیوں کیا۔ حالانکہ وہ شیعہ مسلک کا آدمی ہے اور اس کے نزدیک تو ذوالفقار حضرت علیؓ ہیں۔ پھر حضرت خالدؓ کو اللہ کی تلوار کے طور پر موضوع بنا کر کیوں کتاب لکھی۔ کتاب پڑھی تو معلوم ہوا کہ یہ بدنیتی پر مبنی ہے۔ کتاب میں حضرت خالدؓ اور حضرت عمرؓ کی جا بجا کردار کشی کی گئی ہے اور ہم سُنیوں کو بتایا گیا ہے کہ یہ ہیں تمہارے ہیروز کے اصلی روپ۔ ایک جنگ و جدل کا ہیرو۔ اور دوسرا عدل کا۔ میں نے جب حضرت جیؒ کو اس کتاب کے متعلق بتایا کو انہوں نے فرمایا کہ اس کتاب کا تفصیل سے مطالعہ کرو۔ اور قابل اعتراض صفحات کی نشاندہی کرو۔ اس کا رد لکھیں گے۔ ان کے حکم کی تعمیل میں میں کوئٹہ میں قاری یار محمد کی مسجد میں بیٹھا یہ کتاب پڑھ رہا تھا۔ حجرے میں حضرت جیؒ تشریف رکھتے تھے۔ یہ کوئی اشتراق

کے بعد کا وقت تھا۔ ایک صاحب مسجد میں داخل ہوئے جب میرے پاس آئے اور مجھے انگریزی کی کتاب پڑھتے دیکھا تو آگ بگولا ہو گئے۔ کہنے لگے تم مولویوں کو کیا ہو گیا ہے۔ لوگوں کو قرآن کا وعظ کرتے ہو اور خود مسجدوں میں انگریزیاں پڑھتے ہو۔ بند کرو یہ ناٹک میں نے کتاب پڑھنا بند کر دی اور وہ جا کر حضرت جیؒ کی مجلس میں بیٹھ۔ کچھ دیر بعد جب میں اندر پہنچا تو اُس نے حضرت جی سے شکایت کی کہ یہ مولوی مسجد میں انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے حضرت جی نے ان کو میرا تعارف کرایا اور ساری بات بتائی تو وہ مطمئن ہو گئے۔

۱۹۷۴ء کے جن دنوں میں منارہ کا سالانہ اجتماع تھا میں اس وقت کوئٹہ انفنٹری سکول میں کمپنی کمانڈر کورس کر رہا۔ چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے اجتماع میں شامل نہ ہو سکا۔ اجتماع کے آخری ایام میں مَیں نے حضرت جی کو ایک عریضہ تحریر کیا جس میں مَیں نے اپنی محرومی کا اظہار کیا اور دُعا اور توجہ خاص کی درخواست کی جواب میں حضرت جیؒ نے بہت ہی حیران کن خبر سنا دی کہ تمہیں سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے نومنتخب مجازوں میں جگہ مل گئی ہے اب تم صاحب مجاز ہو اور صاحب منصب بھی۔ پھر جب مَیں تعمیل حکم میں خرقہ لینے کے لیے چکڑالہ حاضر ہوا تو حضرت جی نے بہت شفقت فرمائی اور بتایا کہ مجازوں کی ابتدائی فہرست جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش ہوئی۔ اس میں تمہارا نام نہیں تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فہرست میں سے کچھ نام کاٹ دیے اور تمہارا نام لکھ دیا۔ اس کے بعد سے حضرت جی قبلہ عالم مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔

ملتان غوث بہاؤالدین ذکریاؒ کے نام کی وجہ سے مشہور ہے۔ حضرت غوث بہاء الدین سہروردی سلسلہ کے بزرگ ہیں اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے شاگرد ہیں۔ ہم نے بھی اپنا جمعرات کا معمول ان کے ہاں رکھا۔ اس کے علاوہ بھی اکثر دبلیستر یٹن اور حاجی محمد اسلم کنبوہ حضرت غوث صاحب کے مزار پر حاضری دیتے۔ اوائل ۱۹۷۶ء تک حضرت جیؒ نے ملتان کے ریلوے سٹیشن سے گزر جانے پر ہی اکتفا کیا۔ مجھے ملتان پہنچے ایک سال ہو گیا تھا جب بھی حضرت غوث صاحب کے ہاں حاضری ہوتی وہ حضرت جیؒ کے ملتان آنے کا مطالبہ کرتے۔ میں نے دبے لفظوں میں حضرت جیؒ کی خدمت میں درخواست پیش کی تو انہوں نے [illegible]

کہ واقعی ان کا شکوہ صحیح ہے۔ پھر حضرت جیؒ ملتان تشریف لے آئے۔ حضرت مولانا محمد اکرم بھی ساتھ تھے۔ حضرت جیؒ نے غوث بہاؤالدین ذکریاؒ کے مزار پر حاضری کا پروگرام بنایا۔ وہاں پر موجود جماعت بھی ساتھ گئی۔ غوث بہاءالدین ذکریاؒ کو بالا منازل کرائے گئے۔ اس کے بعد جب حضرت جیؒ واپس ہو رہے تھے تو کسی ساتھی نے حضرت جی سے کہا کہ حضرت رکن عالم بھی ملاقات کی درخواست کر رہے ہیں۔ حضرت جیؒ مسکرا دیے اور کہا کہ چلو۔ پھر کچھ دیر وہاں مراقبہ فرمایا۔

۱۹۷۱ء کی جنگی قیدیوں کی واپسی کے بعد جماعت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ مولوی محمد سلیمان نے معمولات میں دو چیزوں کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیا۔ عصر کے بعد ذکر جہر اور مراقبہ استحضار۔ چونکہ حضرت جیؒ نے کبھی یہ نہیں کرائے تھے۔ اس لیے مجھے بہت کوفت ہوتی تھی۔ مگر میں ان کے گروہ میں بیٹھا تو رہتا مگر کڑھتا رہتا۔ مولوی محمد سلیمان نے قریب قریب سب ذکر کرنے والوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ عصر کے وقت ذکر جہر کرایا کریں۔ ملتان میں مَیں یہ ذکر نہیں کراتا تھا۔ اس بات کا علم جب مولوی محمد سلیمان کو ہوا تو وہ اور لبشیر ایک دن منارہ کے اجتماع کے دوران مجھے ایک طرف لے گئے۔ اور سختی سے ڈانٹا کہنے لگے۔ تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔ تمہاری مجازیت ہم ایک منٹ میں ختم کرا سکتے ہیں۔ لہٰذا آج کے بعد ترقی منازل کے لیے عصر کے وقت کا ذکر جہر اور مراقبہ استحضار باقاعدگی سے کیا کرو۔ میں خاموش ہو گیا۔ دو سال تک مولوی محمد سلیمان مجھ سے ناراض رہے۔ مجھے ان کی طرف سے ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں واقعی حضرت جیؒ کو کہہ کر مجھے جماعت سے نہ نکلوا دیں۔ حضرت جیؒ حاجی الطاف کے گھر قیام پذیر تھے۔ کھانا کھانے کے لیے جب سب لوگ باہر چلے گئے تو میں نے حضرت جیؒ کے پاؤں پکڑ لیے اور رونے لگا۔ حضرت جی نے مجھ سے پوچھا کیا بات ہے۔ جواب میں مَیں نے مولوی سلیمان کا سارا واقعہ بتایا اور عرض کی کہ وہ مجھے جماعت سے نکلوانے پر تلے ہوئے ہیں۔ میں نے حضرت جیؒ سے درخواست کی کہ وہ حجت کے طور پر ایک دفعہ ذکر جہر اور مراقبہ استحضار کرا دیں۔ پھر ہم اس کو اپنے معمولات کا حصہ بنا لیں گے حضرت جیؒ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم نے یہ اذکار آج تک نہیں کیے میں نے جواب دیا کہ میرے شیخ نے جو اذکار نہ کرائے ہوں میں دوسروں کے کہنے سے کیسے کر سکتا ہوں۔ حضرت جیؒ بہت خوش ہوئے، فرمانے [illegible]

انہوں نے اپنے سرہانے کے نیچے سے کتاب نکال کر مجھے دی اور کہا کہ اس نے تو دلائل السلوک کے مقابلے میں کتاب بھی لکھ دی ہے حیرانی ہے ایسے شخص کی عقل پر۔

مارچ ۱۹۸۱ء میں حضرت جیؒ جب ملتان تشریف لائے تو ڈنر کے لیے بریگیڈیر خادم حسین اور چائے کے لیے میجر جنرل حمزہ کی دعوت کو بھی قبول فرمایا۔ یہ دونوں افسر آرمی میں اپنی شرافت اور نیکی کی وجہ سے منفرد مقام رکھتے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں میری پوسٹنگ ناردرن ایریا میں ہو گئی تو جنرل حمزہ نے وہاں کے کمانڈر میجر جنرل کو میرے بارے میں خط لکھا۔ مئی ۱۹۸۲ء کے تیسرے ہفتے میں حضرت جیؒ کا گلگت کا دورہ تھا۔ ۱۷ مئی کو رات ڈاسو میں تھی اور ۱۸ مئی کو دن کا کھانا میرے ہاں جگلوٹ میں تھا مگر خلافِ توقع حضرت جیؒ ڈاسو کو نظر انداز کر کے شام ۱۷ مئی کو ہی میرے ہاں جگلوٹ پہنچ گئے۔ سفر سے کافی نڈھال نظر آتے تھے میں نے فوراً رسول میر کو اطلاع کی اور پھر ہم دونوں نے مل کر حضرت جی کے مختصر سے قافلے کا رات کا رہائش کا بندوبست کیا۔ اگلے روز صبح دس بجے ۹۰ لائٹ کی جیپ مجھے لینے آ گئی۔ کہ جنرل صاحب اُدھر آئے ہوئے ہیں اور چائے پر تمہیں بلایا ہے ہیں۔ میں نے اپنے کرنل کو بتایا کہ میں جنرل صاحب سے ملنے نہیں جا سکتا کیونکہ میرے شیخ المکرم اِدھر تشریف رکھتے ہیں ان کو چھوڑ کر میں کسی کے پاس نہیں جا سکتا۔ میرے کرنل نے مجھے کہا کہ خدا کے لیے میری نوکری خراب مت کرو۔ تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے مرشد کے پاس بیٹھتا ہوں اور وہ اپنے بوٹ اتار کر حضرت جیؒ کے پاس آ بیٹھا۔ مگر میں نے نہ جانا تھا نہ گیا۔ جب خالی جیپ واپس وہاں پہنچی تو جنرل صاحب نے اس کا بُرا منایا جو بعد میں مجھے وہاں پر موجود دیگر افسران کی زبانی معلوم ہوا۔ بعد ازاں حضرت جیؒ نے مجھے بتایا کہ تمہارے کرنل کے اندر خلوص نظر نہیں آیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت وہ عقیدت کی وجہ سے آپ کی خدمت میں نہیں آیا تھا وہ تو محض مجھے جنرل وڈ ایچ کے پاس بھیجنے کی خاطر میری جگہ پُر کرنے کے لیے آیا تھا حصولِ فیض میں وہ یقین ہی نہیں رکھتا۔

۱۹۸۳ء کا سالانہ اجتماع منارہ ۲۵ جولائی سے لے کر ۲ ستمبر تک تھا۔ اس دفعہ میں نے دو ماہ کی رخصت لی اور شروع ہفتے میں دارالعرفان پہنچ گیا۔ حضرت جی اپنے بیٹے اسد بھائی کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ آئے دن گھر سے قاصد دارالعرفان جا کر حضرت جی کی پریشانی میں اضافہ کر رہے تھے۔ ایک روز حضرت جیؒ نے مجھے طلب کیا اور فرمایا کہ تم چکڑالہ چلے جاؤ اور وہاں کے دفاع کی ڈیوٹی سنبھال لو اور اپنے ساتھ چھ سات آدمی بھی لے جاؤ اور ان کو ایک ہفتے کے بعد واپس بھیج دینا۔ میں یہ آدمی لے کر چکڑالہ پہنچ گیا اور مرشد آباد والی زمین پر مورچہ سنبھال لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری مدد کی اور کسی کو زمین پر قبضہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ہر ہفتے دارالعرفان سے مجھے نئی کمک پہنچتی رہی۔ جب منارہ کا اجتماع ختم ہو گیا تو حضرت جیؒ واپس چکڑالہ تشریف لے آئے اور مجھے بدستور اسی جگہ رہنے کا حکم سنایا۔ عید الضحیٰ سے دو روز قبل حضرت جیؒ نے مجھے جانے کی اجازت فرمائی۔ میں رخصت ہونے سے پہلے حضرت جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت جی گھر سے باہر دیوار کے سائے میں تشریف فرما تھے سری لنکا کا رضا قریش میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں حضرت جیؒ کے پاس نیچے بیٹھ گئے۔ حضرت جی نے پوچھا جا رہے ہو۔ میں نے عرض کیا جی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے گھنٹے گزر گئے یہاں تک کہ دیوار کا سایہ ختم ہونے لگا۔ اور حضرت جیؒ کی چارپائی پر آدھی دھوپ آ گئی تھی۔ گرمی کی وجہ سے تھوڑا تھوڑا پسینہ بھی آنے لگا۔ اب حضرت جی نے مجھے جانے کی اجازت فرمائی اور وہ چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے میں حضرت سے ملا اور حضرت کے پاؤں پر گر پڑا۔ میں نے حضرت جی کے دونوں پاؤں پکڑ کر عرض کیا کہ حضرت زندگی کا پتہ نہیں کہ پھر ملاقات ہو کہ نہ ہو۔ مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو آپ مجھے معاف فرما دیں۔ حضرت جیؒ آپ مجھ سے راضی رہنا۔ حضرت جی نے مجھے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور فرمانے لگے کہ تم جماعت کے ان آدمیوں میں سے ہو جن سے میرا قلبی تعلق ہے۔ میں تم سے کیسے ناراض ہو سکتا ہوں۔ اس کے بعد میں رخصت ہوا اور اللہ تعالیٰ کی شان دیکھو کہ حضرت جیؒ سے میری یہی آخری ملاقات تھی۔ مجھے جگلوٹ میں ٹیلیفون پر راولپنڈی سے حضرت جیؒ کے انتقال پُرملال کی اطلاع ملی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ جب میں چکڑالہ پہنچا تو حضرت جی کو اپنی آخری آرام گاہ مل چکی تھی۔ اپنی گلگت کی جماعت کے ساتھ قبر پر حاضر ہوا اور معمول کیا۔ وہی انوارات وہی تجلیات جو پہلے تھیں اب بھی ہیں۔ حضرت جی فرماتے تھے میرے مرنے کے بعد مجھ سے زیادہ فیض ملے گا بشرطیکہ رابطہ رہا۔ اللہ تعالیٰ شیخ المکرمؒ سے رابطہ قائم رکھے اور ان کا فیض تا قیامت جاری رہے۔ آمین!

Phone : 546734
Res: 448914

AL-BARKAAT ESTATES

Property Consultants/Advisors
Rent Purchase & Sales

Capt. (Retd.) Khurshid Ahmed

6, 13-C, 12th Commercial Street Opp. Highway Motors
Phase 2, Defence Housing Authority Karachi.

ٹیلیفون ۵۴۶۷۳۴

گھر: ۴۴۸۹۱۴

البرکت اسٹیٹس

مشیرانِ جائداد

مکان، بنگلہ، کوٹھی کرایہ پر حاصل کرنے، خریدنے یا فروخت کرنے نیز قطعات اراضی کے لیے ہم سے مشورہ کریں۔

کیپٹن (ریٹائرڈ)
خورشید احمد

۱۳۰۶، سی، ۱۲ کمرشل سٹریٹ بالمقابل ہائی موٹرز،
فیز ۲۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی،

تصوّف کیا نہیں

تصوّف کے لیے نہ کشف و کرامات شرط ہے نہ دُنیا کے کاروبار میں ترقی دِلانے کا نام تصوّف ہے، نہ تعویذ گنڈوں کا نام ہے نہ جھاڑ پھونک سے بیماری دُور کرنے کا نام تصوّف ہے نہ مقدمات جیتنے کا نام تصوّف ہے، نہ قبروں پر سجدہ کرنے، ان پر چادریں چڑھانے اور چراغ جلانے کا نام تصوّف ہے اور نہ آنے والے واقعات کی خبر دینے کا نام تصوّف ہے نہ اولیاء اللہ کو غیبی ندا کرنا مشکل کُشا اور حاجت روا سمجھنا تصوّف ہے، نہ اِس میں ٹھیکیداری ہے کہ پیر کی ایک توجّہ سے مُرید کی پُوری اِصلاح ہو جائے گی اور سلوک کی دولت بغیر مجاہدہ اور بدُون اِتّباعِ سُنّت حاصل ہو جائے گی۔ نہ اِس میں کشف و اِلہام کا صحیح اُترنا لازمی ہے اور نہ وَجد و تواجد اور رقص و سرود کا نام تصوّف ہے۔ یہ سب چیزیں تصوّف کا لازمہ بلکہ عین تصوّف سمجھی جاتی ہیں حالانکہ ان میں سے کسی ایک چیز پر تصوّفِ اِسلامی کا اِطلاق نہیں ہوتا بلکہ یہ ساری خرافات اِسلامی تصوّف کی عین ضِد ہیں۔

(دلائل السُّلوک)

ہماری مطبوعات

حضرت العلام مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ

○ تصوف

- تعارف —— 5/- روپے
- دلائل السلوک (اردو) —— 60/- روپے
- دلائل السلوک (انگریزی) —— 100/- روپے
- اسرار الحرمین —— 15/- روپے
- عقائد و کمالات علماء دیوبند —— 10/- روپے
- علم و عرفان —— 5/- روپے

○ حیات بعد الموت :

- سیف اویسیہ —— 10/- روپے
- حیات برزخیہ —— 30/- روپے
- حیات انبیاء —— 15/- روپے
- حیات النبی —— 15/- روپے

○ شیعیت ۔ تحقیقی مطالعہ :

- الدین الخالص —— 30/- روپے
- ایمان بالقرآن —— 25/- روپے
- تحذیر المسلمین —— 40/- روپے
- تفسیر آیات اربعہ —— 10/- روپے
- تحقیق حلال و حرام —— 15/- روپے
- حرمت ماتم —— 10/- روپے
- ایجاد مذہب شیعہ —— 10/- روپے
- شکست اعدائے حسین رض —— 10/- روپے
- داماد علی رض —— 20/- روپے
- بنات رسول ص —— 10/- روپے
- الجمال والکمال —— 10/- روپے
- عقیدۂ امامت اور اس کی حقیقت —— 5/- روپے

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

- اسرار التنزیل حصہ اول —— 60/- روپے
- (مجلد) حصہ دوم —— 100/- روپے
- دیار حبیب میں چند روز —— 10/- روپے
- ارشاد السالکین (اول) —— 15/- روپے
- ارشاد السالکین (دوم) —— 5/- روپے
- ارشاد السالکین (انگریزی) —— 15/- روپے
- امیر معاویہ رض —— 10/- روپے
- راہی کرب و بلا —— 5/- روپے
- عصر حاضر کا امام —— 5/- روپے
- شیعہ مذہب کے بنیادی عقائد —— 5/- روپے
- حیات طیبہ (انگریزی) —— 10/- روپے
- نور و بشر کی حقیقت —— 5/- روپے

پروفیسر حافظ عبدالرزاق ایم اے اسلامیات، عربی

- ذکر اللہ (عربی) —— 5/- روپے
- لغزشیں —— 10/- روپے
- اطمینان قلب —— 15/- روپے
- تصوف و تعمیر سیرت —— 15/- روپے
- کس لیے آئے تھے؟ —— 10/- روپے
- خدایا ایں کرم بار دگر کن —— 10/- روپے
- بزم انجم —— 20/- روپے
- دین و دانش —— 10/- روپے
- کونوا عباد اللہ —— 5/- روپے
- انوار التنزیل —— 10/- روپے
- مغالطے —— 15/- روپے

اویسیہ کتب خانہ

سول ایجنٹ ◎ الوہاب مارکیٹ ○ غزنی سٹریٹ ○ اردو بازار لاہور